رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۳۴۴۰

شوال ۱۳۷۴ھ جلد ۴۴ عدد ۴

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ — لاہور پاکستان

چندہ سالانہ چھ روپے قیمت فی پرچہ دس آنے

صفحه خالی

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۴۴ | شوال ۱۳۷۴ھ - مطابق جون ۱۹۵۵ء | عدد ۴

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

ایک طویل مدت کے بعد ان صفحات میں پھر اظہارِ خیال کا موقع مل رہا ہے۔ اس مدت میں اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت و ربوبیت کے جو تجربات ہوئے وہ اس سے بہت زیادہ ہیں کہ یہ بندۂ عاجز ان کے شکر کا حق ادا کر سکے، اور اس بندے کے گناہ اس سے بدرجہا زیادہ ہیں کہ یہ اپنے آپ کو مالک کی ان عنایات کا کسی درجے میں بھی مستحق سمجھے۔ دعا ہے کہ جس آقا نے اتنا کچھ فضل و کرم فرمایا ہے وہی اپنے بندے کو اتنی توفیق بھی بخشے کہ وہ مستقبل میں اپنے ماضی کے قصوروں کی تلافی کر سکے اور دینِ حق کی کوئی ایسی خدمت بجا لائے جو آخرت میں قبولیت سے نوازی جانے کے لائق ہو۔ اپنے مخلص احباب اور تمام خیرخواہوں سے بھی درخواست کرتا ہوں کہ وہ میرے حق میں اسی چیز کی دعا فرمائیں۔

میری ناچیز خدمات کو جو لوگ قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں انہیں فطرۃً میری خلافِ توقع واپسی پر غیر معمولی مسرت ہوئی ہے۔ ان کی طرف سے اس مسرت کا اظہار جس خلوص و محبت کے ساتھ کیا گیا اس کے لیے میں اُن سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس کا اجر ضرور عطا فرمائے گا، کیونکہ میرے ساتھ ان کی یہ محبت کسی ذاتی تعلق کی بنا پر نہیں ہے بلکہ محض اللہ اور اس کے دین کی خاطر ہے۔ کاش میرا مولیٰ مجھے فی الواقع اُس حسنِ ظن کا مستحق بنا دے جو اس کے بہت سے بندے مجھ سے رکھتے ہیں، اور مجھ کو ان نیک توقعات کے پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے جو دینِ حق کی صحیح خدمت کے لیے انہوں نے مجھ سے وابستہ کی ہیں۔

اس کے ساتھ میں یہ عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ دوستوں کے اظہارِ مسرت اور جذبۂ محبت و قدر افزائی نے بعض مواقع پر کچھ ایسی شکلیں اختیار کی ہیں جن میں اعتدال کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ میرے لیے ان کو روکنا بھی مشکل ہوتا ہے، کیونکہ زہد و انکسار کی نمائش مجھے پسند نہیں ہے، اور ان کو گوارا کرنا بھی مشکل ہوتا ہے، کیونکہ

میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ چیزیں اپنے اندر فتنہ بننے کی اچھی خاصی صلاحیت رکھتی ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ میرے دوست کم از کم میرے متعلق اپنے جذبات کے اظہار میں حدِ اعتدال سے بھی کچھ کم ہی پر اکتفا کیا کریں۔

میری غیر حاضری کا زمانہ اگرچہ بکثرت حوادث سے لبریز گزرا ہے، لیکن دو حادثے خصوصیت کے ساتھ ایسے تھے جنہوں نے مجھے سخت متاثر کیا۔

ان میں سے پہلا حادثہ مولانا مسعود عالم ندوی کی وفات کا ہے جس کا نقصان کچھ وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو ان کے اوصاف اور کاموں سے واقف ہیں۔ وہ اس ملک کے اُن چند گنے چنے لوگوں میں سے تھے جن کو عربی ادب و انشا میں ایک بلند مقام حاصل ہوا ہے۔ اپنی اس قابلیت سے کام لے کر انہوں نے برِعظیم ہند و پاکستان کے مسلمانوں اور عربی زبان بولنے والے مسلمانوں کے درمیان سفارت کے وہ فرائض انجام دیے جو شاید اس دور کے کسی دوسرے شخص نے کم از کم اس حد تک انجام نہیں دیئے۔ عرب ممالک کو یہاں کے حالات اور مسائل اور تحریکوں سے روشناس کرنے میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے اور اس خدمت کی قدر و قیمت کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں معلوم ہے کہ مختلف مسلمان ملکوں کے درمیان براہِ راست ذرائعِ معلومات کا نہ ہونا اور ان کا ایک دوسرے کو جاننے کے لیے محض فرنگی وسائلِ اطلاعات پر انحصار کرنا کتنا نقصان دہ ہے۔ اس لحاظ سے ان کی وفات درحقیقت ایک قومی نقصان ہے جس کی تلافی کرنے والے کم ہی نظر آتے ہیں۔

جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والوں نے ان کے فقدان کو خاص طور پر شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے، کیونکہ انہیں مرحوم کی خوبیوں اور خدمات سے براہِ راست سابقہ پیش آیا ہے۔ وہ ایک ایسے حلقے سے تعلق رکھتے تھے جس کے اکابر جماعت اسلامی کو پسند نہ کرتے تھے۔ دوسری طرف، جماعت اسلامی کی بنا جن لوگوں نے ڈالی تھی اُن میں سے کسی کے ساتھ بھی مرحوم کے شخصی مراسم نہ تھے بلکہ مجھ سمیت، اکثر سے ان کی کبھی ملاقات تک نہ ہوئی تھی۔ اس کے باوجود مرحوم نے محض "ترجمان القرآن" میں جماعت اسلامی کی دعوت اور

نصب العین پڑھ کر بلا تکلف اس کو قبول کیا اور خود اس کی طرف بڑھنے میں پیش قدمی کی، بغیر اس کے کہ ادھر سے کوئی تحریک کی گئی ہو۔ یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ ان کا دل تعصب سے پاک تھا، وہ اپنی رائے میں آزاد تھے، ان کا ضمیر انصاف پسند تھا، اور وہ جس چیز کو حق پاتے تھے اسے پورے خلوص کے ساتھ قبول کر لیتے تھے۔ بعد میں تیرہ چودہ سال کے قریبی تعاون کے دوران میں ہر موقع پر ان کے یہ اوصاف عملاً مشاہدے میں آتے رہے۔ اس کے ساتھ ذہنی توازن کا یہ حال تھا کہ جماعت سے گہرا تعلق ہو جانے کے بعد بھی اپنے اُن اکابر سے ان کے ذاتی تعلق میں کوئی فرق نہ آیا۔ نہ اُن کی محبت و عقیدت جماعت کے ساتھ ان کی وابستگی میں کبھی خلل انداز ہوئی اور نہ جماعت سے وابستگی نے اُن کے ساتھ شخصی روابط کو کبھی غبار آلود کیا۔

جماعت میں شامل ہوتے ہی انہوں نے محسوس کر لیا کہ جس نصب العین کو اب وہ اختیار کر چکے ہیں وہ ہمہ تن پوری زندگی کا وقف نامہ طلب کرتا ہے۔ چنانچہ کچھ دیر نہ گزرنے پائی تھی کہ وہ اپنی ساری کشتیاں جلا کر آگئے اور جماعتی نظام کے تحت انہوں نے "دار العروبہ" قائم کیا جس کا مقصد تحریک اسلامی کے لٹریچر کو عربی میں منتقل کر کے انڈونیشیا سے مراکو تک پھیلی ہوئی اسلامی دنیا تک پہنچانا تھا۔ اس کے ساتھ انہوں نے ایسے نوجوان تیار کرنے کی کوشش بھی شروع کر دی جو صحیح عربی لکھنے پر قادر ہوں تاکہ وہ ان کے کام کو آئندہ جاری رکھ سکیں۔ اور یہ سب کچھ انہوں نے ایک ایسی جانگسل بیماری کی حالت میں کیا جس نے ان کو گھلا کر صرف ہڈی اور چمڑے کا ڈھانچہ بنا ڈالا تھا۔ یہ ان کے عزم اور اخلاصِ نیت اور جذبۂ ایثار و قربانی کا حال تھا۔ وہ ایک چیز کو حق جاننے کے بعد اسے صرف قبول ہی کر کے نہ رہ گئے، بلکہ اس کو فروغ دینے کے لیے انہوں نے اپنی جان لڑا دی، اس کی خاطر اپنی دنیوی ترقی کے سارے مواقع کو (جو ان جیسی قابلیت کے آدمی کے لیے کچھ کم درخشاں نہ تھے) قربان کر دیا، اپنا سارا وقت اور سارا سرمایۂ قوت و صلاحیت اسی ایک راہ میں کھپا دیا۔ یہ خوبی جہاں، جس انسان میں بھی پائی جاتی ہو، بجائے خود قابلِ قدر ہے۔ خصوصاً ہماری قوم میں تو اس وقت اس صفت کے حامل لوگوں کا قحط ہے۔ اس لیے ان کی قدر و قیمت اس سے بدرجہا زیادہ ہے

جو کسی "مالدار" قوم میں ہو سکتی ہے۔

۱۹۵۳ء میں جماعت اسلامی پر جو دورِ ابتلا آیا (بلکہ سچ یہ ہے کہ زبردستی لایا گیا) اُس میں مرحوم کا صبر و ثبات ہم سب کے لیے قابلِ رشک ہے۔ وہ سالہا سال سے دمے کے مریض تھے، ایسے سخت مریض کہ دمے کے دورے کی وہ شدت کبھی ہمارے مشاہدے میں نہیں آئی۔ ان کی صحت تمام تر دوا اور غذا کے خاص اہتمام اور اوقات کی باقاعدگی پر منحصر تھی، اور ان چیزوں میں سے کسی میں بھی فرق آجانا ان کے لیے پیامِ موت تھا۔ اِس حالت میں حکومت نے یکایک ان کو گرفتار کر کے جیل میں بند کیا اور ان کے مرض کا لحاظ کر کے علاج و غذا کا کوئی خاص انتظام نہ کیا۔ حتیٰ کہ اس مریضِ ناتواں کو جیل میں چارپائی تک نہ دی گئی۔ جو لوگ اس ظلم کے ذمہ دار تھے ان کو قطعاً کوئی احساس نہ تھا کہ وہ اپنی قوم کے کیسے قیمتی جوہر کو ضائع کر رہے ہیں۔ اور مرحوم کی غیرت یہ گوارا کرنے کے لیے تیار نہ تھی کہ اپنے مرض کا حوالہ دے کر کسی ظالم سے رحم کی بھیک مانگیں۔ جو تکلیفیں بھی پیش آئیں کمال درجہ صبر اور تسلیم و رضا کے ساتھ جھیلتے چلے گئے اور اُف تک نہ کی۔ بعید نہیں کہ یہی چیز آخر کار ان کی اچانک وفات کی موجب ہوئی ہو۔ بہر حال چلتے چلتے اُس مردِ مومن نے استقامت کا ایک ایسا نمونہ پیش کیا جو بہت سے اہلِ ایمان کے لیے تقویتِ قلب کا سبب بنا اور انشاءاللہ آئندہ بھی بنے گا۔

تیرہ چودہ سال کی رفاقت میں ہم لوگوں نے ان کو ہمیشہ ایک مخلص دوست، ایک بے لاگ مشیر اور ایک وسیع القلب و وسیع النظر انسان پایا۔ بہت سی باتوں میں دوسروں سے اختلاف رکھنے، اور حسبِ ضرورت اظہارِ اختلاف کرنے کے باوجود وہ اپنی رائے میں کبھی اتنی شدت اختیار نہ کرتے تھے کہ ان کے ساتھ موافقت مشکل ہو جاتی۔ رائے میں نہایت آزاد اور اظہار رائے میں نہایت بیباک تھے مگر بحث و تمحیص کے بعد جب جماعت کوئی فیصلہ کر لیتی تھی تو اسے پوری فراخ دلی کے ساتھ قبول کر لیتے تھے اور اسے کامیاب کرنے میں اپنی حد تک کوئی کسر نہ اُٹھا رکھتے تھے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اپنی رائے کے خلاف کسی جماعتی فیصلے پر وہ کبیدہ خاطر ہوئے ہوں، یا ان کے گوشۂ قلب میں بھی یہ خواہش چھپی ہوئی پائی گئی ہو کہ وہ فیصلہ ناکام

ہو اور اُن کی رائے کی صحت ثابت ہو جائے ۔ اجتماعی زندگی کے لیے یہ صفت اکسیر کا حکم رکھتی ہے ۔
ذاتی حیثیت سے ان کی وفات میرے لیے ایک صدمۂ عظیم ہے ۔ تعریف اور مذمت کرنے والوں کی کمی نہیں ہے ، مگر خیر خواہ ناصح دنیا میں کم ہی میسر آتے ہیں ۔ رحمۃ اللہ وطاب ثراہ

دوسرا اور اس سے بدرجہا زیادہ شدید حادثہ مصر میں اخوان المسلمون پر فوجی آمریت کے مجنونانہ حملے کا تھا جس کی اطلاعات نے قلب و روح کو مدتوں سخت اذیت میں مبتلا رکھا اور جس کی اذیت اب بھی کم نہیں ہوئی ہے ۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارے لیے اخوان اور ان پر ظلم کرنے والے فوجی حاکم دونوں یکساں ہیں ۔ ایمان کے رشتے نے دونوں کو ہمارا بھائی بنایا ہے اور ہم ان کے درمیان اپنے اور غیر کی تمیز نہیں کر سکتے ۔ لیکن ایمان ہی نے ہمیں یہ سکھایا ہے کہ ہم ظالم اور مظلوم میں فرق کریں ، ظالم کا ہاتھ پکڑیں یا کم از کم اس کے ظلم کو برا جانیں ، اور مظلوم کے حق میں انصاف کی بات کہیں ۔ علاوہ بریں ہمارے لیے ، جب تک کہ ہم مسلمان ہیں ، قومی اور نسلی اور وطنی تفریقیں کوئی چیز نہیں ہیں ۔ ہم پاکستان اور دوسرے مسلم ممالک میں کوئی فرق نہیں سمجھتے ۔ مسلمان جہاں بھی ہے ہمارا بھائی ہے ، اور اس کا گھر ہمارا گھر ہے ۔ مشرق سے لے کر مغرب تک جس مسلمان ملک میں بھی کوئی خرابی رونما ہوتی ہے اس پر ہم ویسی ہی اذیت محسوس کرتے ہیں جیسی اپنے ملک میں کسی خرابی کے پیش آنے پر کر سکتے ہیں ۔ یہ ہمارے ایمان کا تقاضا ہے ، اور ہم یہ بات کبھی نہیں مان سکتے کہ ہر ملک کے مسلمان اپنے اپنے ملک سے غرض رکھیں ، دوسرے مسلم ممالک کے معاملات میں دخل نہ دیں ۔ ایک مسلمان ملک یا اس کی حکومت کو غلط راستے پر جاتے ہوئے دیکھ کر آخر ہم یہ کہے بغیر کیسے رہ سکتے ہیں کہ وہ غلط راستے پر جا رہا ہے ۔

مصر کے فوجی حکمران اگر اس بات سے غافل ہیں تو انہیں اس سے آگاہ کرنا ہمارا فرض ہے کہ ان کے تمام پروپیگنڈے کے باوجود ، اور صحیح اطلاعات پر پردہ ڈالنے کی ساری کوششوں کے باوجود ، دنیا کو یہ یقین نہیں آ سکا ہے کہ اخوان کو کچلنے کے لیے جس سیاسی جرم کو انہوں نے بنیاد قرار دیا وہ فی الواقع اخوان کا جرم تھا ۔ چند مسحور

یا اقتدار پرست یا متعصب لوگوں کے سوا ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ دراصل یہ ایک سازش کا نتیجہ تھا جو نہایت بھونڈے پن اور بدسلیقگی کے ساتھ محض اس غرض کے لیے کی گئی تھی کہ فوجی حکمراں اپنے ملک کی آخری باا‌ثر حزب مخالف کو بھی ختم کر دینے کے لیے ایک بہانہ پیدا کر سکیں۔ اس گمان کو جس چیز نے یقین کی حد تک پہنچا دیا وہ فوجی حکمرانوں کا رچایا ہوا وہ مضحکہ انگیز عدالتی ڈراما تھا جو اخوان پر مقدمہ چلانے کے لیے انہوں نے بغیر کسی شرم و حیا کے ساری دنیا کو دکھایا۔ ممکن ہے کہ فوجی حکمراں اس غلط فہمی میں ہوں کہ دنیا نے اُن کی قائم کردہ "عدالتوں" کو واقعی عدالت ہی سمجھ لیا اور یہ باور کر لیا کہ اخوان باقاعدہ ایک عدالتی کارروائی کے بعد مجرم ثابت ہو گئے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس ڈرامے سے اخوان کا جرم ثابت کرنے کے بجائے مصر کے موجودہ حکمرانوں نے اپنے اخلاق کی ایک ایسی گھناؤنی تصویر دنیا کے سامنے پیش کی جس پر کوئی شریف آدمی فخر نہیں کر سکتا۔ شاید یہ بات بغیر کسی مبالغے کے کہی جا سکتی ہے کہ چشم فلک نے روئے زمین پر عدالت کے نام سے ایسا شرمناک ڈراما ہوتے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس کے بعد جو سزائیں اخوان کو دی گئیں، جس طرح چند نہایت قیمتی جانوں کو ضائع کیا گیا، جس طرح تیس چالیس ہزار انسانوں کو حوالۂ زنداں کیا گیا، جس طرح قیدیوں کی آزادی سلب کرنے پر بھی فوجی حکمرانوں کے دل ٹھنڈے نہ ہوئے اور انہیں حالتِ قید میں ہولناک عذاب دیے گئے اور آج قیدیوں کے بال بچوں کو بھوکا مارنے کے لیے ان کے تمام ذرائعِ رزق بند کرنے کی جو تدبیریں کی جا رہی ہیں، اُس کے تمام واقعات دنیا کے سامنے آ چکے ہیں۔ اِن کارناموں پر وہ لوگ تو مصری حکمرانوں کو داد دے سکتے ہیں جن کے دل اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بغض سے بھرے ہوئے ہیں، مگر ایک مسلمان تو اپنے کسی مسلمان بھائی کو اس ظلم پر، اس برادر کشی پر، اس غیر مہذب، بلکہ غیر انسانی رویے پر داد نہیں دے سکتا۔ ابھی پچھلے دنوں کی بات ہے کہ ہندوستان کے ایک شہر میں پنڈت جواہر لال نہرو پر ایک شخص نے حملہ کیا تھا۔ اس پر پنڈت جی نے جو شریفانہ رویہ اختیار کیا وہ بھی ساری دنیا نے دیکھ لیا، اور مصر کے رئیس الحکومت پر ایک شخص کے اقدام قتل نے جو گل کھلائے وہ بھی سب نے دیکھے۔ کیا ایک غیر مسلم کے مقابلے میں ایک مسلمان اور اس کے حامیوں کے اخلاق اور ظرف کی یہ کیفیت دیکھ کر دنیا کا کوئی مسلمان شرم سے سر جھکا لینے کے سوا اور بھی کچھ کر سکتا ہے؟

مصر کے فوجی افسر اس دعوے کے ساتھ اُٹھے تھے کہ وہ اپنے ملک کو شاہ فاروق کے ظلم و استبداد سے نجات دلانا چاہتے ہیں۔ مگر فاروق اور اس کے خاندان نے اپنی پادشاہی کی پوری تاریخ میں جو کچھ کیا تھا اس سے بہت زیادہ ان فوجی افسروں نے تھوڑی سی مدت میں کر ڈالا۔

انگریزوں نے بھی اپنے دورِ تسلط میں اتنا ظلم و ستم نہ کیا تھا حتیٰ کہ سرلی اسٹیک کے واقعۂ قتل پر جو زیادتیاں انہوں نے مصر اور مصریوں کے ساتھ کیں وہ بھی اُن زیادتیوں کے مقابلے میں ماند پڑ گئیں جو کرنل ناصر پر قاتلانہ حملے کو بہانہ بنا کر خود گھر والے اپنے ہی بھائیوں پر کر گزرے۔

آج دنیا بھر کے مسلمان اُن مظالم پر ماتم کناں ہیں جو شمالی افریقہ کے مسلمانوں پر فرانسیسی ڈھا رہے ہیں۔ مگر ہم کس منہ سے اس کا شکوہ کریں جبکہ ہماری اپنی تلواریں ہمارا گلا کاٹنے میں اغیار کی تلواروں سے کچھ کم تیز نہیں ہیں۔

اِن حالات کی وجہ سے مصر کی عزت دنیا بھر میں مجروح ہو گئی ہے۔ مصر نے اپنے اہلِ علم و فضل، اپنی درسگاہوں، اپنے لٹریچر اور اپنے تمدن کی بنا پر جو وقار حاصل کیا تھا اس کو چند فوجی افسروں نے اپنے سفیہانہ طرزِ عمل سے شدید صدمہ پہنچا دیا۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص بھی ایک ایسے ملک کے متعلق اچھی رائے قائم نہیں کر سکتا جہاں عدالت کے نام سے وہ مذاق کیا جائے جو مصر میں کیا گیا، جہاں بڑے بڑے نامور آدمیوں کو اس نام نہاد ثبوت پر پھانسی اور طویل قید کی سزائیں دی جائیں جس پر دنیا کی کوئی عدالت ایک دن کی بھی سزا نہ دے سکے، جہاں سیاسی قیدیوں کے ساتھ ان کے علم اور ان کی عزت اور مرتبے کا لحاظ کیے بغیر وہ وحشیانہ سلوک کیا جائے جو مہذب ملکوں میں اخلاقی مجرموں کے ساتھ بھی نہیں کیا جاتا، جہاں ہزارہا آدمیوں کو قید کرنے کے بعد حکومت اس بات سے بھی دلچسپی لے کہ ان کی عورتوں اور ان کے بچوں کو کہیں سے رزق نہ ملنے پائے، جہاں ایک آدمی اس جرم پر بھی دھر لیا جائے کہ وہ کسی سیاسی قیدی کے پیچھے اس کے بے سہارا پس ماندوں کی مالی مدد کر رہا ہے۔ یہ حرکتیں ایک ملک کے حکمران اپنی طاقت کے نشے میں کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ جب تک طاقت ان کے پاس ہے کوئی ان کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ اس طرح کی حرکتیں کرنے والوں میں ان کی عزت باقی رہ جائے۔ عزت تو در کنار، ایسے لوگوں کی کوئی ساکھ بھی دنیا میں نہیں ہو سکتی۔ ظاہر داری

کی بنا پر ان کے ساتھ احترام کا نمائشی برتاؤ اس وقت تک ہوتا رہیگا جب تک وہ اپنے ملک کی حکومت پر قابض ہیں۔ مگر ان کے کارناموں کو دیکھ کر سب ہی سمجھ گئے کہ یہ کم ظرف لوگ ہیں، کسی ضابطۂ اخلاق اور آئین تہذیب کے پابند نہیں ہیں، موقع پا کر سب کچھ کر گزرنا ان کے لیے ممکن ہے، اس لیے ان سے حذر کرنا چاہیے۔

پھر سوڈان کے مسئلے میں مصر کو جو زک پہنچی اور پہنچ رہی ہے وہ براہِ راست نتیجہ ہے اس فوجی آمریت کا جو مصر میں قائم ہے۔ سوڈان کا مسئلہ مصر کے لیے اہم ترین مسئلہ ہے۔ کیونکہ اس کی زندگی تمام تر نیل پر منحصر ہے اور نیل سوڈان ہی کے علاقے سے گزر کر مصر میں پہنچتا ہے۔ سالہا سال سے مصر کی تمنا اور کوشش یہ تھی کہ دونوں ملک ایک غیر منفک رابطہ میں منسلک ہو جائیں تاکہ کبھی دونوں کے مفاد آپس میں متصادم نہ ہو سکیں۔ یہ مقصود بالکل قریب الحصول ہو چکا تھا۔ انگریز سوڈان کو یہ حق دینے پر راضی ہو چکے تھے کہ وہ چاہیں تو مصر کے ساتھ مل جائیں اور چاہیں تو اپنی الگ ریاست بنالیں۔ سوڈان کے نئے انتخابات ان لوگوں کو برسرِ اقتدار لے آئے تھے جو مصر سے اتحاد کو پسند کرتے تھے۔ اب صرف اتنی کسر باقی تھی کہ معاہدے کے مطابق سوڈانی رائے عام اپنا فیصلہ صادر کرے۔ ٹھیک اس نازک موقع پر مصر میں فوجی ڈکٹیٹر شپ نے برہنہ ہو کر اپنے بدترین اوصاف نمایاں کرنے شروع کر دیئے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی تھا اور یہی ظاہر ہو کر رہا کہ سوڈان کی رائے عام مصر سے متنفر ہو گئی۔ آخر دنیا کی کونسی قوم ایسی احمق ہو سکتی ہے کہ وہ جان بوجھ کر اپنے آپ کو فوجی ڈکٹیٹر شپ کی چکی میں پسنے کے لیے سپرد کر دے درآنحالیکہ وہ اس سے بچنے کا موقع پاتی ہو۔ کس کی شامت نے دھکا دیا ہے کہ وہ آزادانہ استصواب رائے میں اس حکومت کے ساتھ مل جانا پسند کرے جس میں سیاسی اختلاف کی سزا پھانسی اور عمر قید سے کم نہ ہو۔ کوئی ملک خود اپنے گھر میں ایک جابرانہ اور ظالمانہ نظام قائم کر کے یہ توقع نہیں کر سکتا کہ وہ کسی دوسرے ملک کی رائے عام کو جیت سکے گا اور اس کو اپنے ساتھ مل جانے کی ترغیب دینے میں کامیاب ہو جائیگا۔

سویز کے مسئلے میں بھی مصر کی فوجی آمریت برطانیہ سے معاملہ کرنے میں درحقیقت بڑی زک اٹھا چکی ہے، اگرچہ وہ اسے اپنی کامیابی سمجھتی ہے، یا کم از کم دنیا کو یقین دلانا چاہتی ہے کہ وہ اس معاملے میں کامیاب رہی ہے۔ جن شرائط پر برطانیہ کو سویز سے اپنی فوجیں ہٹانے پر راضی کیا گیا ہے اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ سویز کے جس فوجی اڈے

کو پہلے وہ اپنے خرچ پر قائم کیے ہوئے تھا، اُسے اب مصر اپنے خرچ پر اُس کے لیے محفوظ رکھے گا۔ برطانوی خزانے سے جو کروڑوں پونڈ سالانہ اس پر خرچ ہو رہے تھے وہ اسے بچ گئے، اس کی فوجیں جو سویز پر پڑی ہوئی تھیں انہیں دوسرے مقامات پر استعمال کرنے کی اسے چھٹی مل گئی، اُس کو یہ اطمینان بھی حاصل ہو گیا کہ بین الاقوامی جنگ کے موقع پر یہ اڈا اس کی فوجوں کو تیار ملے گا، اور مصر اس خطرے سے محفوظ نہ ہو سکا کہ جب کبھی اس طرح کی جنگ چھڑے تو وہ اُس میں آپ سے آپ الجھ جائے اب یہ ہر صاحب عقل خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ یہ برطانیہ کی کامیابی ہے یا مصر کی؟

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں کوئی ایسی حکومت جو خود اپنی قوم کو طاقت کے زور سے دبا دے اور رائے عام کی تائید کے بغیر فرمانروائی کرے، بین الاقوامی معاملات میں کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکتی۔ جو اپنی قوم کو دبائیگا اسے لامحالہ دوسروں سے دبنا پڑیگا۔ کیونکہ اس کے ہمسائے اس بات سے بے خبر نہیں ہوتے کہ قومی طاقت اس کی پشت پر نہیں ہے۔ ملک میں ایک آزاد پریس کی موجودگی، آزاد جماعتوں کی موجودگی، اور آزادانہ انتخابات پر حکومت کے رہنے اور مٹنے کا انحصار صرف ملک کے اندر ہی مفید نہیں ہے بلکہ بیرونی طاقتوں سے معاملہ کرنے میں بھی اس کے بڑے اہم اثرات ہوتے ہیں۔ جو حکومت رائے عام کی تائید سے برسرِ اقتدار آتی ہے اس کی بات بین الاقوامی برادری میں زیادہ وزنی ہوتی ہے۔ اس سے معاملہ کرتے وقت دنیا سمجھتی ہے کہ یہ معاملہ ایک شخص یا چند اشخاص سے نہیں پوری قوم سے ہو رہا ہے۔ جن شرائط پر قوم کو راضی نہ کیا جا سکے، یا جن شرائط کے خلاف ملک میں ایک طاقتور آواز بلند ہو رہی ہو، ان کو رد کر دینا یا کم از کم ان کو نرم کروانے کی کوشش کرنا ایسی حکومت کے لیے آسان ہوتا ہے۔ مصر کی فوجی آمریت نے اس کے برعکس پوزیشن اختیار کی، حتیٰ کہ عین اُس وقت جبکہ وہ برطانیہ سے سویز کے متعلق معاملہ کرنے جا رہی تھی، اس نے ملک کی ایک ہی بچی کھچی حزبِ اختلاف کو بھی دبا دیا۔ اس کے بعد وہ برطانیہ سے دب کر معاملہ نہ کرتی تو اور کیا کر سکتی تھی۔

حال میں دنیا کے متعدد مسلمان ملک جس طرح کے انقلابات اور اچانک تغیرات کے آماج گاہ بنتے رہے ہیں انہوں نے بحیثیتِ مجموعی مسلمانوں کے وقار کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ آخر

مسلمانوں کو وہ کیا بیماری لگی ہوئی ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی آزادی کا صحیح استعمال نہیں کرسکتے۔ اپنے ملکوں میں کوئی پائدار اور مستقل نظام قائم نہیں کرسکتے، اور اپنی قومی طاقت کو تعمیر و ترقی کے لیے مجتمع کرنے کے بجائے آپس کی کشمکش اور اقتدار کی چھینا جھپٹ اور ایک دوسرے کے بنائے ہوئے کو بگاڑنے میں صرف کرتے رہتے ہیں۔ اس صورتِ حال نے داخلی حیثیت سے مسلم ریاستوں کو کمزور اور خارجی حیثیت سے بے وزن کرکے رکھ دیا ہے اور اس کے نہایت بُرے اثرات ہر پہلو سے مسلمان ملکوں کے مفاد پر پڑ رہے ہیں۔

دنیا نے آج تک اجتماعی زندگی کے تجربات سے جتنے مفید سبق سیکھے ہیں، یہاں ان سب کو بھلا دیا جاتا ہے اور اُن غلطیوں کو بار بار دُہرایا جاتا ہے جو انسانی تاریخ کے دوران میں پے در پے بُرے نتائج دکھا چکی ہیں۔ مثال کے طور پر اسی فوجی اقتدار کو لیجیے جسے ملکی نظام کی اصلاح کے لیے بڑا سستا نسخہ سمجھ کر مسلمان ملکوں میں بے تکلف استعمال کر ڈالا جاتا ہے۔ بظاہر اس سے زیادہ آسان کوئی بات بھی نہیں ہے کہ ملک کی فوج خود اپنے ملک پر قبضہ کر لے اور مارشل لا کے زور سے اپنا حکم چلانے لگے۔ دنیا کا کوئی ملک بھی اپنے آپ کو خود اپنی فوج سے نہیں بچا سکتا خواہ وہ انگلستان اور امریکہ جیسا طاقتور ہی کیوں نہ ہو۔ مگر فرانس جیسے ملک میں بھی، جہاں آئے دن سیاسی جماعتوں اور لیڈروں کی نااتفاقی کی وجہ سے وزارتیں بدلتی رہتی ہیں، نہ تو کوئی فوجی لیڈر یہ خواب دیکھتا ہے کہ لاؤ میں فوج کی طاقت سے اپنے ملک کی اس سیاسی بے ثباتی کا خاتمہ کرکے ایک پائیدار حکومت قائم کردوں، اور نہ کوئی صدر یا وزیر اعظم ہی اپنے لائحہ عمل کو (جسے وہ بہرحال مفید ہی سمجھتا ہوگا) نافذ کرنے کے لیے کبھی فوج سے مدد لینے کا خیال کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہاں کے فوجی افسر نالائق یا سیاسی لیڈر فوج کے استعمال سے ناواقف ہیں۔ بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہاں کے فوجی اور سیاسی، دونوں طرح کے لیڈر ملکی سیاست میں فوج کی مداخلت کے نقصانات سے واقف ہیں اور ان میں عقل اور حب الوطنی کی اتنی کمی نہیں ہے کہ جان بوجھ کر اُس غلطی کا ارتکاب کریں جو تاریخ میں کبھی کسی ملک اور قوم کے حق میں بھی مفید ثابت نہیں ہوئی ہے۔ لیکن مسلمانوں میں ایسے بہت سے بہادر فوجی پائے جاتے ہیں جو باہر کچھ فتح کرنے کا موقع نہ پاکر خود اپنے ہی ملک کو فتح کر ڈالتے ہیں، اور یہاں ایسے عقلمند ماہرین سیاست بھی نایاب نہیں ہیں جو ملکی مسائل کی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے فوج کے ناخن تدبیر کو دعوت دینے میں تامل نہیں کرتے۔

ملکی سیاست میں فوج کی مداخلت اور ملک پر فوجی اقتدار کے نقصانات اس قدر ظاہر و باہر ہیں کہ ایک معمولی عقل و خرد کا آدمی بھی ان کو سمجھنے سے قاصر نہیں ہو سکتا۔ فوج اپنے ملک پر حکومت کرنے کے لیے نہیں بلکہ ملک کو بیرونی دشمنوں سے بچانے کے لیے منظم کی جاتی ہے۔ ملک کے لوگ اپنی گاڑھی کمائی سے نکالے ہوئے ٹیکس دے کر اپنے سپاہیوں کے لیے اسلحہ اور تنخواہیں اس لیے مہیا نہیں کرتے کہ یہ سپاہی منظم اور مسلح ہو کر خود انہی کو دبا لیں، بلکہ یہ سب کچھ وہ اس لیے کرتے ہیں کہ باہر کے دشمنوں سے وہ ان کی آزادی کی حفاظت کریں۔ فوج کو تعلیم و تربیت بھی ملک کا انتظام کرنے کے لیے نہیں دی جاتی بلکہ دشمنوں سے لڑنے کے لیے دی جاتی ہے۔ اسے مار دھاڑ اور سختی و درشتی اس لیے نہیں سکھائی جاتی کہ وہ اپنے ملک اور اپنی ہی قوم کو جوتے کے زور سے سیدھا کرنے کی کوشش کرے اور سنگین کی نوک سے ملک میں اپنا حکم منوائے، بلکہ یہ اوصاف اس میں اعدائے وطن کو سرنگوں کرنے کے لیے پیدا کیے جاتے ہیں۔ اب اگر اخلاقی حیثیت سے دیکھیے تو اس سے بڑی غداری کوئی نہیں ہو سکتی کہ ایک فوج جن لوگوں کے روپے سے منظم اور مسلح ہوئی ہو وہ طاقت پا کر خود انہی کی گردن پر سوار ہو جائے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک گھر کے چوکیدار ایکا کر کے خود گھر پر قابض ہو جائیں۔ بلکہ اس سے بھی بدتر مثال اس فعل کی یہ ہے کہ جوان بیٹے ماں باپ کی محنتوں سے پروان چڑھ کر خود ماں باپ ہی کے سینے پر سوار ہو جائیں۔ اور اگر مصلحت کے لحاظ سے دیکھیے تو اس حرکت کے تین نتائج بالکل کھلے ہوئے ہیں جو لازماً اس سے رونما ہوتے ہیں۔

اول یہ کہ ملک کے باشندے خود اپنی فوج سے متنفر ہو جائیں اور ملک کی حفاظت کے لیے فوج اور قوم کا تعاون ممکن نہ رہے۔

دوم یہ کہ باشندگانِ ملک کا جذبۂ حبِ وطن ایک جابرانہ نظام میں رہتے رہتے بالآخر سرد پڑ جاتا ہے انہیں اس امر سے کوئی دلچسپی نہ رہے کہ ملک کا بھلا ہوتا ہے یا برا، بلکہ وہ آزاد بھی رہتا ہے یا نہیں۔

سوم یہ کہ ملک ایسے انقلابات و تغیرات کی آماجگاہ بن جائے جو باشندگانِ ملک کے افکار و اقدار اور خواہشات کی تبدیلیوں کا نتیجہ نہ ہوں بلکہ سازشوں اور طاقت کے خلاف طاقت کے استعمال کا نتیجہ ہوں۔

تھوڑی دیر کے لیے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ کسی وقت ایک ظالم شخص یا گروہ کی حکمرانی سے ملک کو نجات دلانے کے لیے فوجی انقلاب ناگزیر ہو جاتا ہے، تب بھی ہم یہ کہیں گے کہ کوئی صاحبِ عقل اور محبِ وطن فوجی گروہ یہ حماقت نہیں کر سکتا کہ وہ ظالموں کو ہٹانے کے بعد خود ملک پر مسلط ہو جائے۔ وہ اگر کچھ بھی عقل اور خیر خواہی کا جذبہ رکھتا ہو تو ایسے انقلاب کے بعد پہلا قدم یہ اٹھانا چاہیے کہ ملک میں آزادانہ انتخابات منعقد کرا کے ملک کا انتظام نمائندگانِ ملک کے حوالے کرے اور خاموشی کے ساتھ اپنی بارکوں میں واپس چلا جائے۔

تفہیم القرآن

الحج

نام | چوتھے رکوع کی دوسری آیت وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول | اس سورے میں مکی اور مدنی سورتوں کی خصوصیات ملی جلی پائی جاتی ہیں۔اسی وجہ سے مفسرین میں اس امر پر اختلاف ہُوا ہے کہ یہ مکی ہے یا مدنی۔لیکن ہمارے نزدیک اس کے مضامین اور انداز بیان کا یہ رنگ اس وجہ سے ہے کہ اس کا ایک حصہ مکی دَور کے آخر میں اور دوسرا حصہ مدنی دَور کے آغاز میں نازل ہُوا ہے۔اس لیے دونوں ادوار کی خصوصیات اس میں جمع ہوگئی ہیں۔

ابتدائی حصے کا مضمون اور انداز بیان صاف بتاتا ہے کہ یہ مکہ میں نازل ہُوا ہے اور اغلب یہ ہے کہ مکی زندگی کے آخری دَور میں ہجرت سے کچھ پہلے نازل ہُوا ہو۔یہ حصہ آیت نمبر ۲۴ (وَھُدُوْا اِلَی الطَّیِّبِ مِنَ الْقَوْلِ وَھُدُوْا اِلٰی صِرَاطِ الْحَمِیْدِ) پر ختم ہوتا ہے۔

اس کے بعد اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ سے یک لخت مضمون کا رنگ بدل جاتا ہے اور صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہاں سے آخر تک کا حصہ مدینۂ طیبہ میں نازل ہُوا ہے۔بعید نہیں کہ یہ ہجرت کے بعد پہلے ہی سال ذی الحجہ میں نازل ہُوا ہو، کیونکہ آیت ۲۵ سے ۴۱ تک کا مضمون اسی بات کی نشان دہی کرتا ہے، اور آیت ۳۹-۴۰ کی شانِ نزول بھی اس کی مؤید ہے۔اُس وقت مہاجرین ابھی تازہ تازہ ہی اپنے گھر بار چھوڑ کر مکہ سے آئے تھے۔حج کے زمانے میں اُن کو اپنا شہر اور حج کا اجتماع یاد آرہا ہوگا اور یہ بات بری طرح کھل رہی ہوگی کہ مشرکین قریش نے اُن پر مسجد حرام کا راستہ تک بند کر دیا ہے۔اُس زمانے میں وہ اِس بات کے بھی منتظر ہونگے کہ جن ظالموں نے ان کو گھروں سے نکالا، مسجد حرام

کی زیارت سے محروم کیا، اور خدا کا راستہ اختیار کرنے پر ان کی زندگی تنگ و دشوار کر دی، اُن کے خلاف جنگ کرنے کی اجازت مل جائے۔ یہ ٹھیک نفسیاتی موقع تھا ان آیات کے نزول کا۔ ان میں پہلے تو حج کا ذکر کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ یہ مسجد حرام اس لیے بنائی گئی تھی اور یہ حج کا طریقہ اس لیے شروع کیا گیا تھا کہ دنیا میں خدائے واحد کی بندگی کی جائے، مگر آج وہاں شرک ہو رہا ہے اور خدائے واحد کی بندگی کرنے والوں کے لیے اس کے راستے بند کر دیے گئے ہیں۔ اس کے بعد مسلمانوں کو اجازت دے دی گئی ہے کہ وہ ان ظالموں کے خلاف جنگ کریں اور انہیں بے دخل کر کے ملک میں وہ نظام صالح قائم کریں جس میں برائیاں دبیں اور نیکیاں فروغ پائیں۔ ابن عباس، مجاہد، عُروہ بن زبیر، زید بن اسلم، مُقاتِل بن حَیّان، قَتادہ اور دوسرے اکابر مفسرین کا بیان ہے کہ یہ پہلی آیت ہے جس میں مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دی گئی۔ اور حدیث و سیرت کی روایات سے ثابت ہے کہ اس اجازت کے بعد فوراً ہی قریش کے خلاف عملی سرگرمیاں شروع کر دی گئیں اور پہلی مہم صفر ۲ ھ میں ساحل بحر احمر کی طرف روانہ ہوئی جو غزوۂ وَدّان یا غزوۂ اَبْواء کے نام سے مشہور ہے۔

موضوع و مبحث | اِس سورہ میں تین گروہ مخاطب ہیں، مشرکین مکہ، مذبذب اور متردد مسلمان، اور مومنین صادقین۔

مشرکین سے خطاب کی ابتدا مکہ میں کی گئی اور مدینے میں جا کر اس کا سلسلہ پورا کیا گیا۔ اس خطاب میں ان کو پورے زور کے ساتھ تنبیہ کیا گیا ہے کہ تم نے ضد اور ہٹ دھرمی کے ساتھ اپنے بے بنیاد جاہلانہ خیالات پر اصرار کیا، خدا کو چھوڑ کر اُن معبودوں پر اعتماد کیا جن کے پاس کوئی طاقت نہیں ہے، اور خدا کے رسول کو جھٹلا دیا۔ اب تمہارا انجام وہی کچھ ہو کر رہے گا جو تم سے پہلے اس روش پر چلنے والوں کا ہو چکا ہے۔ نبی کو جھٹلا کر اور اپنی قوم کے صالح ترین عنصر کو نشانۂ ستم بنا کر تم نے اپنا ہی کچھ بگاڑا ہے۔ اس کے نتیجے میں خدا کا جو غضب تم پر نازل ہوگا اس سے تمہارے بناوٹی معبود تمہیں نہ بچا سکیں گے۔ اس تنبیہ و انذار کے ساتھ افہام و تفہیم کا پہلو بالکل خالی نہیں چھوڑ دیا گیا ہے۔ پوری سورۃ میں جگہ جگہ تذکیر اور نصیحت بھی ہے اور شرک کے خلاف اور توحید و آخرت کے حق میں مؤثر دلائل بھی پیش کیے گئے ہیں۔

مذبذب مسلمان، جو خدا کی بندگی قبول تو کر چکے تھے مگر اس راہ میں کوئی خطرہ برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے، ان کو خطاب کرتے ہوئے سخت سرزنش کی گئی ہے۔ ان سے کہا گیا ہے کہ یہ آخر کیسا ایمان ہے کہ راحت، مسرت، عیش نصیب ہو تو خدا تمہارا خدا اور تم اس کے بندے۔ مگر جہاں خدا کی راہ میں مصیبت آئی اور سختیاں جھیلنی پڑیں، پھر نہ خدا تمہارا خدا رہا اور نہ تم اس کے بندے رہے۔ حالانکہ تم اپنی اس روش سے کسی ایسی مصیبت اور نقصان اور تکلیف کو نہیں ٹال سکتے جو خدا نے تمہارے نصیب میں لکھ دی ہو۔

اہلِ ایمان سے خطاب دو طریقوں پر کیا گیا ہے۔ ایک خطاب ایسا ہے جس میں وہ خود بھی مخاطب ہیں اور عرب کی رائے عام بھی، مگر دوسرے خطاب میں صرف اہلِ ایمان مخاطب ہیں۔

پہلے خطاب میں مشرکینِ مکہ کی اس روش پر گرفت کی گئی ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے لیے مسجدِ حرام کا راستہ بند کر دیا ہے، حالانکہ مسجدِ حرام اُن کی ذاتی جائداد نہیں ہے اور وہ کسی کو حج سے روکنے کا حق نہیں رکھتے یہ اعتراض نہ صرف یہ کہ بجائے خود حق بجانب تھا، بلکہ سیاسی حیثیت سے یہ قریش کے خلاف ایک بہت بڑا حربہ بھی تھا۔ اس سے عرب کے تمام دوسرے قبائل کے ذہن میں یہ سوال پیدا کر دیا گیا کہ قریش حرم کے مجاور ہیں یا مالک؟ اگر آج اپنی ذاتی دشمنی کی بنا پر وہ ایک گروہ کو حج سے روک دیتے ہیں اور اس کو برداشت کر لیا جاتا ہے تو کیا بعید ہے کہ کل جس سے بھی ان کے تعلقات خراب ہوں اس کو وہ حدودِ حرم میں داخل ہونے سے روک دیں اور اس کا عمرہ و حج بند کر دیں۔ اس سلسلے میں مسجدِ حرام کی تاریخ بیان کرتے ہوئے ایک طرف یہ بتایا گیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے جب خدا کے حکم سے اس کو تعمیر کیا تھا تو سب لوگوں کو حج کا اذنِ عام دیا تھا اور وہاں اول روز سے مقامی باشندوں اور باہر سے آنے والوں کے حقوق یکساں قرار دیے گئے تھے۔ دوسری طرف یہ بتایا گیا ہے کہ یہ گھر شرک کے لیے نہیں بلکہ خدائے واحد کی بندگی کے لیے تعمیر ہوا تھا، اب یہ کیا غضب ہے کہ وہاں ایک خدا کی بندگی تو ہو ممنوع اور بتوں کی پرستش کے لیے ہو پوری آزادی۔

دوسرے خطاب میں مسلمانوں کو قریش کے ظلم کا جواب طاقت سے دینے کی اجازت عطا کی گئی ہے اور ساتھ ساتھ ان کو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جب تمہیں اقتدار حاصل ہو تو تمہاری روش کیا ہونی چاہیے

اور اپنی حکومت میں تم کو کس مقصد کے لیے کام کرنا چاہیے۔ یہ مضمون سورہ کے وسط میں بھی ہے اور آخر میں بھی۔ آخر میں گروہ اہلِ ایمان کے لیے "مسلم" کے نام کا باقاعدہ اعلان کرتے ہوئے یہ فرمایا گیا ہے کہ ابراہیم کے اصل جانشین تم لوگ ہو، تمہیں اس خدمت کے لیے منتخب کر لیا گیا ہے کہ دنیا میں شہادت علی الناس کے مقام پر کھڑے ہو، اب تمہیں اقامتِ صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ اور فعل الخیرات سے اپنی زندگی کو بہترین نمونے کی زندگی بنانا چاہیے اور اللہ کے اعتماد پر اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جہاد کرنا چاہیے۔

اس موقعہ پر سورۂ بقرہ اور سورۂ انفال کے دیباچوں پر بھی نگاہ ڈال لی جائے تو سمجھنے میں زیادہ سہولت ہوگی۔

اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے

لوگو! اپنے رب کے غضب سے بچو، حقیقت یہ ہے کہ قیامت کا زلزلہ بڑی (ہولناک) چیز ہے[1]۔

---

[1] یہ زلزلۂ قیامت کی ابتدائی کیفیات میں سے ہے اور اغلب یہ ہے کہ اس کا وقت وہ ہوگا جبکہ زمین یکایک الٹی پھرنی شروع ہو جائے گی اور سورج مشرق کے بجائے مغرب سے طلوع ہوگا۔ یہی بات قدیم مفسرین میں سے علقمہ اور شعبی نے بیان کی ہے کہ یکون ذالک عند طلوع الشمس من مغربھا۔ اور یہی بات اس طویل حدیث سے معلوم ہوتی ہے جو ابن جریر اور طبرانی اور ابن ابی حاتم وغیرہ نے حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے نقل کی ہے۔ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے کہ نفخِ صور کے تین مواقع ہیں۔ ایک نفخِ فزع، دوسرا نفخِ صعق اور تیسرا نفخِ قیام لرب العالمین۔ یعنی پہلا نفخ عام سراسیمگی پیدا کرے گا، دوسرے نفخ پر سب مر کر گر جائیں گے اور تیسرے نفخ پر سب لوگ زندہ ہو کر خدا کے حضور پیش ہو جائیں گے۔ پھر پہلے نفخ کی تفصیلی کیفیت بیان کرتے ہوئے آپ بتاتے ہیں کہ اس وقت زمین کی حالت اس کشتی کی سی ہوگی جو موجوں کے تھپیڑے کھا کر ڈگمگا رہی ہو، یا اس معلق قندیل کی سی جس کو ہوا کے جھونکے بری طرح جھنجھوڑ رہے ہوں۔ اس وقت زمین کی آبادی پر جو کچھ گزرے گی اس کا نقشہ قرآن مجید میں مختلف مقامات پر کھینچا گیا ہے۔ مثلاً

فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ	پس جب صور میں ایک پھونک ماردی جائے گی

جس روز تم اسے دیکھو گے، حال یہ ہو گا کہ ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچے سے غافل ہو جائے گی۔

وَحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ (الحاقہ)

اور زمین اور پہاڑ اٹھا کر ایک ہی چوٹ میں توڑ دیئے جائیں گے تو وہ واقعۂ عظیم پیش آ جائے گا۔

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا (زلزال)

جبکہ زمین پوری کی پوری ہلا ماری جائے گی، اور اپنے پیٹ کے بوجھ نکال پھینکے گی، اور انسان کہیگا کہ یہ اس کو کیا ہو رہا ہے۔

يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ قُلُوْبٌ يَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ (النازعات - ۱)

جس روز ہلا مارنے گا زلزلے کا ایک جھٹکا اور اس کے بعد دوسرا جھٹکا، اس دن دل کانپ رہے ہونگے اور نگاہیں خوف زدہ ہونگی۔

اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا (الواقعہ - ۱)

جس روز زمین جھنجھوڑ ڈالی جائے گی اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر غبار کی طرح اڑنے لگیں گے۔

فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ (المزمل - ۱)

اگر تم نے پیغمبر کی بات نہ مانی تو اس دن کی آفت سے کیسے بچو گے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا اور جس کی شدت سے آسمان پھٹا پڑتا ہو گا۔

اگرچہ بعض مفسرین نے اس زلزلے کا وقت وہ بتایا ہے جبکہ مُردے زندہ ہو کر اپنے رب کے حضور پیش ہونگے اور اس کی تائید میں متعدد احادیث بھی نقل کی ہیں، لیکن قرآن کا صریح بیان ان روایات کو قبول کرنے میں مانع ہے۔ قرآن اس کا وقت وہ بتا رہا ہے جبکہ مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلاتے پلاتے چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہونگی، اور پیٹ والیوں کے پیٹ گر جائیں گے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ آخرت کی زندگی میں نہ کوئی عورت اپنے بچے کو دودھ پلا رہی ہوگی اور نہ کسی حاملہ کے وضع حمل یا اسقاط کا کوئی موقع ہو گا، کیونکہ قرآن کی واضح تصریحات کی رُو سے وہاں سب رشتے منقطع ہو چکے ہونگے اور ہر شخص اپنی انفرادی حیثیت سے خدا کے سامنے حساب دینے کے لیے کھڑا ہو گا۔ لہٰذا قابل ترجیح وہی روایت ہے جو ہم نے پہلے نقل کی ہے۔ اگرچہ اس کی سند ضعیف ہے مگر قرآن سے مطابقت اس کے ضعف کو دور کر دیتی ہے۔

ہر حاملہ کا حمل گر جائے گا، اور لوگ تم کو مدہوش نظر آئیں گے، حالانکہ وہ نشے میں نہ ہوں گے، بلکہ اللہ کا عذاب ہی کچھ ایسا سخت ہو گا۔ ۳؎

بعض لوگ ایسے ہیں جو علم کے بغیر اللہ کے بارے میں بحثیں کرتے ہیں ۴؎ اور ہر شیطان سرکش کی پیروی کرنے لگتے ہیں، حالانکہ اس کے تو نصیب ہی میں یہ لکھا ہے کہ جو اس کو دوست بنائے گا اسے وہ گمراہ کر کے چھوڑے گا اور عذابِ جہنم کا راستہ دکھائے گا۔ لوگو، اگر تمہیں زندگی بعدِ موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر نطفے سے ۵؎، پھر خون کے لوتھڑے سے،

اور یہ دوسری روایات گو سنداً قوی تر ہیں، لیکن قرآن کے ظاہر بیان سے عدمِ مطابقت ان کو ضعیف کر دیتی ہے۔

۲؎ آیت میں مُرْضِع کے بجائے مُرْضِعَہ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ عربیت کے لحاظ سے دونوں میں فرق یہ ہے کہ مُرضِع اس عورت کو کہتے ہیں جو دودھ پلانے والی ہو، اور مُرضِعَہ اُس حالت میں بولتے ہیں جبکہ وہ بالفعل دودھ پلا رہی ہو اور بچہ اس کی چھاتی منہ میں لیے ہوئے ہو۔ پس یہاں نقشہ یہ کھینچا گیا ہے کہ جب وہ قیامت کا زلزلہ آئے گا تو مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلاتے پلاتے چھوڑ کر بھاگ نکلیں گی اور کسی ماں کو یہ ہوش نہ رہے گا کہ اس کے لاڈلے پر کیا گذری۔

۳؎ واضح رہے کہ یہاں اصل مقصودِ کلام قیامت کا حال بیان کرنا نہیں ہے بلکہ خدا کے عذاب کا خوف دلا کر اُن باتوں سے بچنے کی تلقین کرنا ہے جو اس کے غضب کی موجب ہوتی ہیں۔ لہٰذا قیامت کی اس مختصر کیفیت کے بعد آگے اصل مقصود پر گفتگو شروع ہوتی ہے۔

۴؎ آگے کی تقریر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اللہ کے بارے میں اُن کے جس جھگڑے پر گفتگو کی جا رہی ہے وہ اللہ کی ہستی اور اس کے وجود کے بارے میں نہیں بلکہ اس کے حقوق اور اختیارات اور اس کی بھیجی ہوئی تعلیمات کے بارے میں تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُن سے توحید اور آخرت منوانا چاہتے تھے، اور اسی پر وہ آپ سے جھگڑتے تھے۔ ان دونوں عقیدوں پر جھگڑا آخر کار جس چیز پر جا کر ٹھیرتا تھا وہ یہی تھی کہ خدا کیا کر سکتا ہے اور کیا نہیں کر سکتا، اور یہ کہ کائنات میں آیا خدائی صرف ایک خدا ہی کی ہے یا کچھ دوسری ہستیوں کی بھی۔

۵؎ اس کا مطلب یا تو یہ ہے کہ ہر انسان اُن مادوں سے پیدا کیا جاتا ہے جو سب کے سب زمین سے حاصل ہوتے ہیں اور اِس تخلیق کی ابتدا نطفے سے ہوتی ہے۔ یا یہ کہ نوعِ انسانی کا آغاز آدم علیہ السلام سے کیا گیا جو براہِ راست

پھر گوشت کی بوٹی سے جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی[۵]۔ (یہ ہم اس لیے بتا رہے ہیں) تاکہ تم پر حقیقت واضح کریں۔ ہم جس (نطفے) کو چاہتے ہیں ایک وقت خاص تک رحموں میں ٹھیرائے رکھتے ہیں، پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں، (پھر تمہیں پرورش کرتے ہیں) تاکہ تم اپنی پوری جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تاکہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے[۶]۔ اور تم دیکھتے ہو کہ زمین سوکھی پڑی ہے، پھر جہاں ہم نے اس پر مینہ برسایا کہ یکایک وہ پھبک اٹھی اور پھول گئی اور اس نے ہر قسم کی خوش منظر نباتات اگلنی شروع کر دی۔ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے[۷]، اور وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے،

مٹی سے بنائے گئے تھے، اور پھر آگے نسلِ انسانی کا سلسلہ نطفے سے چلا، جیسا کہ سورۂ سجدہ میں فرمایا: وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ مَاءٍ مَهِينٍ (رکوع ۱) "انسان کی تخلیق مٹی سے شروع کی پھر اس کی نسل ایک ست سے چلائی جو حقیر پانی کی شکل میں نکلتا ہے"۔

[۵] یہ اشارہ ہے اُن مختلف اطوار کی طرف جن سے ماں کے پیٹ میں بچہ گزرتا ہے۔ ان کی وہ تفصیلات بیان نہیں کی گئیں جو آج کل صرف طاقت ور خوردبینوں ہی سے نظر آسکتی ہیں، بلکہ ان بڑے بڑے نمایاں تغیرات کا ذکر کیا گیا ہے جن سے اس زمانے کے عام بدو بھی واقف تھے یعنی نطفہ قرار پانے کے بعد ابتداءً جمے ہوئے خون کا ایک لوتھڑا سا ہوتا ہے، پھر وہ گوشت کی ایک بوٹی میں تبدیل ہوتا ہے جس میں پہلے شکل صورت کچھ نہیں ہوتی اور آگے چل کر انسانی شکل نمایاں ہوتی چلی جاتی ہے۔ اسقاط کی مختلف حالتوں میں چونکہ تخلیقِ انسانی کے یہ سب مراحل لوگوں کے مشاہدے میں آتے تھے، اس لیے انہی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے علم الجنین کی تفصیلی تحقیقات کی نہ اُس وقت ضرورت تھی نہ آج ہے۔

[۶] یعنی بڑھاپے کی وہ حالت جس میں آدمی کو اپنے تن بدن کا ہوش بھی نہیں رہتا۔ وہی شخص جو دوسروں کو عقل بتاتا تھا، بڈھا ہو کر اس حالت کو پہنچ جاتا ہے جو بچے کی حالت سے مشابہ ہوتی ہے۔ جس علم و واقفیت اور تجربہ کاری و جہاں دیدگی پر اس کو ناز تھا وہ ایسی بے خبری میں تبدیل ہو جاتی ہے کہ بچے تک اس کی باتوں پر ہنسنے لگتے ہیں۔

اور یہ (اس بات کی دلیل ہے) کہ قیامت کی گھڑی آکر رہے گی، اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں، اور اللہ ضرور اُن لوگوں کو اٹھائے گا جو قبروں میں جا چکے ہیں۔[۹]

[۸] اس سلسلۂ کلام میں یہ فقرہ تین معنی دے رہا ہے۔ ایک یہ کہ اللہ ہی سچا ہے اور تمہارا یہ گمان محض باطل ہے کہ موت کے بعد دوبارہ زندگی کا کوئی امکان نہیں۔ دوسرے یہ کہ اللہ کا وجود محض ایک خیالی اور فرضی وجود نہیں ہے جسے بعض عقلی مشکلات رفع کرنے کی خاطر مان لیا گیا ہو۔ وہ نرا فلسفیوں کے خیال کا آفریدہ، واجب الوجود اور علت العلل (FIRST CAUSE) ہی نہیں ہے بلکہ وہ حقیقی فاعل مختار ہے جو ہر آن اپنی قدرت، اپنے ارادے، اپنے علم اور اپنی حکمت سے پوری کائنات اور اس کی ایک ایک چیز کی تدبیر کر رہا ہے۔ تیسرے یہ کہ وہ کھلنڈرا نہیں ہے کہ محض دل بہلانے کے لیے کھلونے بنائے اور پھر یونہی توڑ پھوڑ کر خاک میں ملا دے۔ وہ حق ہے۔ اس کے سب کام سنجیدہ اور بامقصد اور پُرحکمت ہیں۔

[۹] ان آیات میں انسان کی پیدائش کے مختلف اطوار، زمین پر بارش کے اثرات، اور نباتات کی پیداوار کو پانچ حقیقتوں کی نشان دہی کرنے والے دلائل قرار دیا گیا ہے:۔

(۱) یہ کہ اللہ ہی حق ہے،

(۲) یہ کہ وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے،

(۳) یہ کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے،

(۴) یہ کہ قیامت کی گھڑی آکر رہے گی، اور

(۵) یہ کہ اللہ ضرور اُن سب لوگوں کو زندہ کر کے اٹھائے گا جو مر چکے ہیں۔

اب دیکھیے کہ یہ آثار ان پانچوں حقیقتوں کی کس طرح نشان دہی کرتے ہیں۔

پورے نظام کائنات کو چھوڑ کر آدمی صرف اپنی ہی پیدائش پر غور کرے تو معلوم ہو جائے کہ ایک ایک انسان کی ہستی میں اللہ کی حقیقی اور واقعی تدبیر ہر وقت بالفعل کارفرما ہے اور ہر ایک کے وجود اور نشوونما کا ایک ایک مرحلہ اس کے ارادی فیصلے پر ہی طے ہوتا ہے۔ بکنے والے کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ ایک لگے بندھے قانون پر ہو رہا ہے جس کو ایک اندھی بہری بے علم و بے ارادہ فطرت چلا رہی ہے۔ لیکن آنکھیں کھول کر دیکھیں کہ ایک ایک فردِ انسانی

جس طرح وجود میں آتا ہے اور پھر جس طرح وہ وجود کے مختلف مراحل سے گزرتا ہے اس میں ایک حکیم و قادر مطلق ہستی کا ارادی فیصلہ کس شان سے کام کر رہا ہے۔ آدمی جو غذا کھاتا ہے اُس میں کہیں انسانی تخم موجود نہیں ہوتا، نہ اس میں کوئی چیز ایسی ہوتی ہے جو نفسِ انسانی کے خواص پیدا کرتی ہو۔ یہ غذا جسم میں جاکر کہیں بال، کہیں گوشت اور کہیں ہڈی بنتی ہے اور ایک خاص مقام پر پہنچ کر یہی اُس نطفے میں تبدیل ہو جاتی ہے جس کے اندر انسان بننے کی استعداد رکھنے والے تخم موجود ہوتے ہیں۔ ان تخموں کی کثرت کا یہ حال ہے کہ ایک وقت میں ایک مرد سے جتنا نطفہ خارج ہوتا ہے اُس کے تخم اگر تقسیم کیے جائیں تو ساری دنیا کی بالغ عورتیں حاملہ ہو سکتی ہیں اور ایک وقت میں ایک عورت سے تراوش پانے والا مادہ جتنے انڈوں پر مشتمل ہوتا ہے اگر کہیں وہ سب بارور ہو جائیں تو کراچی اور لاہور کی مجموعی آبادی سے زیادہ آبادی پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ کسی حکیم تدبیر کا فیصلہ ہے جو ایک مرد و عورت کے اندر پیدا ہونے والے اس قدر بے شمار انڈوں اور تخموں میں سے کسی ایک جوڑے کو ایک خاص وقت پر استقرارِ حمل کے لیے منتخب کرتا ہے۔ پھر استقرار کے وقت مرد کے تخم اور عورت کے بیضی خلیے (EGG - CELL) کے ملنے سے جو چیز ابتداءً بنتی ہے وہ اتنی چھوٹی ہوتی ہے کہ خوردبین کے بغیر نہیں دیکھی جاسکتی۔ یہ حقیر سی چیز ۹ مہینے اور چند روز میں رحم کے اندر پرورش پاکر جن بے شمار حلوں سے گزرتی ہوئی ایک جیتے جاگتے انسان کی شکل اختیار کرتی ہے، ان میں سے ہر مرحلے پر غور کرو تو تمہارا دل گواہی دیگا کہ یہاں ہر آن ایک حکیم فعّال کا ارادی فیصلہ کام کرتا رہا ہے۔ وہی فیصلہ کرتا ہے کہ کسے تکمیل کو پہنچانا ہے اور کسے خون کے لوتھڑے یا گوشت کی بوٹی، یا ناتمام بچے کی شکل میں ساقط کر دینا ہے۔ وہی فیصلہ کرتا ہے کہ کس کو زندہ نکالنا ہے اور کس کو مردہ۔ کس کو معمولی انسان کی صورت و ہیئت میں نکالنا ہے اور کسے اَن گنت غیر معمولی صورتوں میں سے کوئی صورت دے دینی ہے۔ کس کو صحیح و سالم نکالنا ہے اور کسے اندھا، بہرا، گونگا یا ٹنڈا اور لنجا بناکر پھینک دینا ہے۔ کس کو خوب صورت بنانا ہے اور کسے بدصورت۔ کس کو مرد بنانا ہے اور کس کو عورت۔ کس کو اعلیٰ درجے کی قوتیں اور صلاحیتیں دے کر بھیجنا ہے اور کسے کودن اور کند ذہن پیدا کرنا ہے۔ یہ تخلیق و تشکیل کا عمل، جو ہر روز کروڑوں عورتوں کے رحموں میں ہو رہا ہے اس کے دوران میں کسی وقت کسی مرحلے پر بھی ایک خدا کے سوا دنیا کی کوئی طاقت ذرہ برابر اثر انداز نہیں ہو سکتی، بلکہ کسی کو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ کس پیٹ میں کیا چیز بن رہی ہے اور کیا بن کر نکلنے والی ہے۔ حالانکہ انسانی آبادیوں کی قسمت بے کم از کم ۹۰ فی صدی فیصلے انہی مراحل میں ہو جاتے ہیں اور

نہیں افراد ہی کے نہیں، قوموں کے، بلکہ پوری نوعِ انسانی کے مستقبل کی شکل بنائی اور بگاڑی جاتی ہے۔ اس کے بعد جو بچے دنیا میں آتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کے بارے میں یہ فیصلہ کون کرتا ہے کہ کسے زندگی کا پہلا سانس لیتے ہی ختم ہو جانا ہے، کسے بڑھ کر جوان ہونا ہے، اور کس کو قیامت کے بوریے سمیٹنے ہیں؟ یہاں بھی ایک غالب ارادہ کارفرما نظر آتا ہے اور غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اُس کی کارفرمائی کسی عالمگیر تدبیر و حکمت پر مبنی ہے جس کے مطابق وہ افراد ہی کی نہیں، قوموں اور ملکوں کی قسمت کے بھی فیصلے کر رہا ہے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر بھی اگر کسی کو اس امر میں شک ہے کہ اللہ "حق" ہے اور صرف اللہ ہی "حق" ہے تو بے شک وہ عقل کا اندھا ہے۔

دوسری بات جو پیش کردہ آثار سے ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ "اللہ مُردوں کو زندہ کرتا ہے"۔ لوگوں کو تو یہ سن کر اچنبھا ہوتا ہے کہ اللہ کسی وقت مُردوں کو زندہ کرے گا، مگر وہ آنکھیں کھول کر دیکھیں تو انہیں نظر آئے کہ وہ تو ہر وقت مُردے جلا رہا ہے۔ جن مادّوں سے آپ کا جسم بنا ہے اور جن غذاؤں سے وہ پرورش پاتا ہے ان کا تجزیہ کر کے دیکھ لیجیے۔ کوئلہ، لوہا، چونا، کچھ نمکیات، کچھ ہوائیں، اور ایسی ہی چند چیزیں اور ہیں۔ ان میں سے کسی چیز میں بھی حیات اور نفسِ انسانی کے خواص موجود نہیں ہیں۔ مگر انہی مردہ بے جان مادّوں کو جمع کر کے آپ کو جیتا جاگتا وجود بنا دیا گیا ہے۔ پھر انہی مادّوں کی غذا آپ کے جسم میں جاتی ہے اور وہاں اس سے مَردوں میں وہ تخم اور عورتوں میں وہ بیضی خلیے بنتے ہیں جن کے ملنے سے آپ ہی جیسے جیتے جاگتے انسان روز بن بن کر نکل رہے ہیں۔ اس کے بعد ذرا اپنے گرد و پیش کی زمین پر نظر ڈالیے۔ بے شمار مختلف چیزوں کے بیج تھے جن کو ہواؤں اور پرندوں نے جگہ جگہ پھیلا دیا تھا، اور بے شمار مختلف چیزوں کی جڑیں تھیں جو جگہ جگہ پیوندِ خاک ہوئی پڑی تھیں۔ ان میں کہیں بھی نباتی زندگی کا کوئی ظہور موجود نہ تھا۔ آپ کے گرد و پیش کی سوکھی زمین ان لاکھوں مُردوں کی قبر بنی ہوئی تھی۔ مگر جونہی کہ پانی کا ایک چھینٹا پڑا، ہر طرف زندگی لہلہانے لگی، ہر مُردہ جڑ اپنی قبر سے جی اُٹھی، اور ہر بے جان بیج ایک زندہ پودے کی شکل اختیار کر گیا۔ یہ احیائے اموات کا عمل ہر برسات میں آپ کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے۔

تیسری چیز اِن مشاہدات سے ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ "اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔ ساری کائنات کو چھوڑ کر صرف اپنی اسی زمین کو لے لیجیے، اور زمین کے بھی تمام حقائق و واقعات کو چھوڑ کر صرف انسان اور نباتات ہی کی زندگی پر نظر ڈال کر دیکھ لیجیے۔ یہاں اس کی قدرت کے جو کرشمے آپ کو نظر آتے ہیں کیا انہیں دیکھ کر کوئی صاحبِ عقل

آدمی یہ بات کہہ سکتا ہے کہ خدا بس وہی کچھ کر سکتا ہے جو آج ہم اسے کرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں اور عمل اگر وہ کچھ اور کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا؛ خدا تو خیر بہت بلند و برتر ہستی ہے، انسان کے متعلق پچھلی صدی تک لوگوں کے یہ انداز تھے کہ یہ صرف زمین ہی پر چلنے والی گاڑیاں بنا سکتا ہے، ہوا پر اڑنے والی گاڑیاں بنانا اس کی قدرت میں نہیں ہے۔ مگر آج کے ہوائی جہازوں نے بتا دیا کہ انسان کے "امکانات" کی حدیں تجویز کرنے میں ان کے اندازے کتنے غلط تھے۔ اب اگر کوئی شخص خدا کے لیے اُس کے صرف آج کے کام دیکھ کر امکانات کی کچھ حدیں تجویز کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے اس کے سوا وہ کچھ نہیں کر سکتا، تو وہ صرف اپنے ہی ذہن کی تنگی کا ثبوت دیتا ہے، خدا کی قدرت بہر حال اس کی باندھی ہوئی حدوں میں بند نہیں ہو سکتی۔

چوتھی اور پانچویں بات، یعنی یہ کہ "قیامت کی گھڑی آ کر رہے گی" اور یہ کہ "اللہ ضرور اُن سب لوگوں کو زندہ کر کے اُٹھائے گا جو مر چکے ہیں"، ان تین مقدمات کا عقلی نتیجہ ہے جو اوپر بیان ہوئے ہیں۔ اللہ کے کاموں کو اس کی قدرت کے پہلو سے دیکھیے تو دل گواہی دے گا کہ وہ جب چاہے قیامت برپا کر سکتا ہے اور جب چاہے اُن سب مرنے والوں کو پھر سے زندہ کر سکتا ہے جن کو پہلے وہ عدم سے وجود میں لایا تھا۔ اور اگر اُس کے کاموں کو اس کی حکمت کے پہلو سے دیکھیے تو عقل شہادت دے گی کہ یہ دونوں کام بھی وہ ضرور کر کے رہیگا کیونکہ ان کے بغیر حکمت کے تقاضے پورے نہیں ہوتے اور ایک حکیم سے یہ بعید ہے کہ وہ ان تقاضوں کو پورا نہ کرے۔ جو محدود سی حکمت و دانائی انسان کو حاصل ہے اس کا یہ نتیجہ ہم دیکھتے ہیں کہ آدمی اپنا مال یا جائداد یا کاروبار جس کے سپرد بھی کرتا ہے اس سے کسی نہ کسی وقت حساب ضرور لیتا ہے۔ گویا امانت اور محاسبے میں ایک لازمی عقلی رابطہ ہے جس کو انسان کی محدود حکمت بھی کسی حال میں نظر انداز نہیں کرتی۔ پھر اسی حکمت کی بنا پر آدمی ارادی اور غیر ارادی افعال کے درمیان فرق کرتا ہے، ارادی افعال کے ساتھ اخلاقی ذمہ داری کا تصور وابستہ کرتا ہے، افعال میں نیک اور بد کی تمیز کرتا ہے، اچھے افعال کا نتیجہ تحسین اور انعام کی شکل میں دیکھنا چاہتا ہے اور بُرے افعال پر سزا کا تقاضا کرتا ہے، حتیٰ کہ خود ایک نظامِ عدالت اس غرض کے لیے وجود میں لاتا ہے۔ یہ حکمت جس خالق نے انسان میں پیدا کی ہے، کیا باور کیا جا سکتا ہے کہ وہ خود اس حکمت سے عاری ہو گا؟ کیا مانا جا سکتا ہے کہ اپنی اتنی بڑی دنیا اتنے سرو سامان اور اس قدر اختیارات کے ساتھ انسان کے سپرد کر کے

بعض اور لوگ ایسے ہیں جو کسی علم[۱۰] اور ہدایت[۱۱] اور روشنی بخشنے والی کتاب[۱۲] کے بغیر گردن اکڑائے ہوئے[۱۳]، خدا کے بارے میں جھگڑتے ہیں تاکہ لوگوں کو راہ خدا سے بھٹکا دیں[۱۴]۔ ایسے شخص کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور قیامت کے روز اُس کو ہم آگ کے عذاب کا مزا چکھائیں گے ـــــ یہ ہے تیرا وہ مستقبل جو تیرے اپنے ہاتھوں نے تیرے لیے تیار کیا ہے ورنہ اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے[۱۵]۔ ع

اور لوگوں میں کوئی ایسا ہے جو کنارے پر رہ کر اللہ کی بندگی کرتا ہے[۱۶]، اگر فائدہ ہوا تو مطمئن ہو گیا اور جو کوئی مصیبت آ گئی تو اُلٹا پھر گیا[۱۷]۔ اس کی دنیا بھی گئی اور آخرت بھی۔ یہ ہے

وہ بھول گیا ہے، اس کا حساب وہ کبھی نہ دے گا؟ کیا کسی صحیح الدماغ آدمی کی عقل یہ گواہی دے سکتی ہے کہ انسان کے جو برے اعمال سزا سے بچ نکلے ہیں، یا جن برائیوں کی متناسب سزا اسے نہیں مل سکی ہے ان کی بازپرس کے لیے کبھی عدالت قائم نہ ہو گی، اور جو بھلائیاں اپنے منصفانہ انعام سے محروم رہ گئی ہیں وہ ہمیشہ محروم ہی رہیں گی؟ اگر ایسا نہیں ہے تو قیامت اور زندگی بعد موت خدائے حکیم کی حکمت کا ایک لازمی تقاضا ہے جس کا پورا ہونا نہیں بلکہ نہ ہونا سراسر بعید از عقل ہے۔

[۱۰] یعنی وہ ذاتی واقفیت جو براہِ راست مشاہدے اور تجربے سے حاصل ہوئی ہو۔

[۱۱] یعنی وہ واقفیت جو کسی دلیل سے حاصل ہوئی ہو یا کسی علم رکھنے والے کی رہنمائی سے۔

[۱۲] یعنی وہ واقفیت جو خدا کی نازل کردہ کتاب سے حاصل ہوئی ہو۔

[۱۳] اس میں تین کیفیتیں شامل ہیں: جاہلانہ ضد اور ہٹ دھرمی، تکبر اور غرورِ نفس، اور کسی سمجھانے والے کی بات کی طرف التفات نہ کرنا۔

[۱۴] پہلے اُن لوگوں کا ذکر تھا جو خود گمراہ ہیں۔ اور اس آیت میں اُن لوگوں کا ذکر ہے جو خود ہی گمراہ نہیں ہیں بلکہ دوسروں کو بھی گمراہ کرنے پر تُلے رہتے ہیں۔

[۱۵] یعنی دائرۂ دین کے وسط میں نہیں بلکہ کنارے پر، یا بالفاظ دیگر کفر و اسلام کی سرحد پر کھڑا ہو کر بندگی کرتا ہے۔ جیسے ایک مذبذب آدمی کسی فوج کے کنارے پر کھڑا ہو۔ اگر فتح ہوتی دیکھے تو ساتھ آ ملے اور شکست

صریح خسارہ[۱۷]۔ پھر وہ اللہ کو چھوڑ کر اُن کو پکارتا ہے جو نہ اُس کو نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ فائدہ، یہ ہے گمراہی کی انتہا

ہوتی دیکھے تو چپکے سے کھسک جائے۔

[۱۶] اس سے مراد ہیں وہ خام سیرت، مضطرب العقیدہ اور بندۂ نفس لوگ جو اسلام قبول تو کرتے ہیں مگر فائدے کی شرط کے ساتھ۔ ان کا ایمان اس شرط کے ساتھ مشروط ہوتا ہے کہ ان کی مرادیں پوری ہوتی رہیں، ہر طرح چین ہی چین نصیب ہو، نہ خدا کا دین ان سے کسی قربانی کا مطالبہ کرے، اور نہ دنیا میں ان کی کوئی خواہش اور آرزو پوری ہونے سے رہ جائے۔ یہ ہو تو خدا سے وہ راضی ہیں اور اس کا دین ان کے نزدیک بہت اچھا ہے۔ لیکن جہاں کوئی آفت آئی، یا خدا کی راہ میں کسی مصیبت اور مشقت اور نقصان سے سابقہ پیش آگیا، یا کوئی تمنا پوری ہونے سے رہ گئی، پھر ان کو خدا کی خدائی اور رسول کی رسالت اور دین کی حقانیت، کسی چیز پر بھی اطمینان نہیں رہتا۔ پھر وہ ہر اس آستانے پر جھکنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں جہاں سے ان کو فائدے کی امید اور نقصان سے بچ جانے کی توقع ہو۔

[۱۷] یہ ایک بہت بڑی حقیقت ہے جو چند لفظوں میں بیان کر دی گئی ہے۔ مذبذب مسلمان کا حال درحقیقت سب سے بدتر ہوتا ہے۔ کافر اپنے رب سے بے نیاز، آخرت سے بے پروا، اور قوانین الٰہی کی پابندیوں سے آزاد ہو کر جب یکسوئی کے ساتھ مادی فائدوں کے پیچھے پڑ جاتا ہے تو چاہے وہ اپنی آخرت کھو دے، مگر دنیا تو کچھ نہ کچھ بنا ہی لیتا ہے۔ اور مومن جب پورے صبر و ثبات اور عزم و استقلال کے ساتھ خدا کے دین کی پیروی کرتا ہے تو اگرچہ دنیا کی کامیابی بھی آخرکار اس کے قدم چوم کر رہتی ہے، تاہم اگر دنیا بالکل ہی اس کے ہاتھ سے جاتی رہے، آخرت میں بہرحال اس کی فلاح و کامرانی یقینی ہے۔ لیکن یہ مذبذب مسلمان نہ اپنی دنیا ہی بنا سکتا ہے اور نہ آخرت ہی میں اس کے لیے فلاح کا کوئی امکان ہے۔ دنیا کی طرف لپکتا ہے تو کچھ نہ کچھ خدا اور آخرت کے ہونے کا گمان جو اس کے دل و دماغ کے کسی کونے میں رہ گیا ہے، اور کچھ نہ کچھ اخلاقی حدود کا لحاظ جو اسلام سے تعلق نے پیدا کر دیا ہے، اس کا دامن کھینچتا رہتا ہے، اور خالص دنیا طلبی کے لیے جس یکسوئی و استقامت کی ضرورت ہے وہ کافر کی طرح اسے بہم نہیں پہنچتی۔ آخرت کا خیال کرتا ہے تو دنیا کے فائدوں کا لالچ اور نقصانات کا خوف، اور خواہشات پر پابندیاں قبول کرنے سے طبیعت کا انکار اس طرف جانے نہیں دیتا۔ بلکہ دنیا پرستی اس کے عقیدے اور عمل کو اتنا کچھ بگاڑ دیتی ہے کہ آخرت میں اس کا عذاب سے بچنا ممکن نہیں رہتا۔ اس طرح وہ دنیا بھی کھوتا ہے اور آخرت بھی۔

وہ اُن کو پکارتا ہے جن کا نقصان اُن کے نفع سے قریب تر ہے[18]، بدترین ہے اُس کا مولیٰ اور بدترین ہے
اُس کا رفیق[19]۔ (اس کے برعکس) اللہ اُن لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے[20]، یقیناً ایسی
جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی۔ اللہ کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے[21]۔ جو شخص یہ
گمان رکھتا ہو کہ اللہ دنیا اور آخرت میں اُس کی کوئی مدد نہ کرے گا اُسے چاہیے کہ ایک رسی کے ذریعے آسمان
تک پہنچ کر شگاف لگائے، پھر دیکھے کہ آیا اُس کی تدبیر کسی ایسی چیز کو رد کر سکتی ہے جو اس کو ناگوار ہے[22]
—— ایسی ہی کھلی کھلی باتوں کے ساتھ ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے، اور ہدایت اللہ جسے چاہتا ہے
دیتا ہے۔

---

[18] پہلی آیت میں معبودانِ غیر اللہ کے نافع و ضار ہونے کی قطعی نفی کی گئی ہے، کیونکہ حقیقت کے اعتبار سے وہ کسی نفع و ضرر کی قدرت نہیں رکھتے۔ دوسری آیت میں اُن کے نقصان کو اُن کے نفع سے قریب تر بتایا گیا ہے، کیونکہ ان سے دعائیں مانگ کر اور ان کے آگے حاجت روائی کے لیے ہاتھ پھیلا کر وہ اپنا ایمان تو فوراً اور یقیناً کھو دیتا ہے، رہی یہ بات کہ وہ نفع اسے حاصل ہو جس کی امید پر اس نے انہیں پکارا تھا، تو حقیقت سے قطع نظر ظاہر حال کے لحاظ سے بھی وہ خود مانے گا کہ اُس کا حصول نہ تو یقینی ہے اور نہ قریب الوقوع۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ اس کو مزید فتنے میں ڈالنے کے لیے کسی آستانے پر اُس کی مراد بر لائے، اور ہو سکتا ہے کہ اس آستانے پر وہ اپنا ایمان بھی بھینٹ چڑھا آئے اور اپنی مراد بھی نہ پائے۔

[19] یعنی جس نے بھی اس کو اس راستے پر ڈالا، خواہ وہ کوئی انسان ہو یا شیطان، وہ بدترین کارساز و سرپرست اور بدترین دوست اور ساتھی ہے۔

[20] یعنی جن کا حال اس مطلب پرست، مذبذب اور بے یقین مسلمان کا سا نہیں ہے، بلکہ جو ٹھنڈے دل سے خوب سوچ سمجھ کر خدا اور رسول اور آخرت کو ماننے کا فیصلہ کرتے ہیں، پھر ثابت قدمی کے ساتھ راہِ حق پر چلتے رہتے ہیں، خواہ اچھے حالات سے سابقہ پیش آئے یا بُرے حالات سے، خواہ مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں یا انعامات کی بارشیں ہونے لگیں۔

[21] یعنی اللہ کے اختیارات غیر محدود ہیں۔ دنیا میں، یا آخرت میں، یا دونوں جگہ وہ جس کو جو کچھ چاہتا ہے دیتا ہے

جو لوگ ایمان لائے[۲۳]، اور جو یہودی ہوئے[۲۴]، اور صابئی[۲۵]، اور نصاریٰ[۲۶]، اور مجوس[۲۷]، اور جن لوگوں نے

اور جس سے جو کچھ چاہتا ہے روک لیتا ہے۔ وہ دینا چاہے تو کوئی روکنے والا نہیں، نہ دینا چاہے تو کوئی دلوانے والا نہیں۔

۲۲ـه اس آیت کی تفسیر میں بکثرت اختلافات ہوئے ہیں۔ مختلف مفسرین کے بیان کئے ہوئے مطالب کا خلاصہ یہ ہے

(۱) جس کا یہ خیال ہو کہ اللہ اس کی (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی) مدد نہ کرے گا وہ چھت سے رسی باندھ کر خودکشی کر لے۔

(۲) 〃 〃 〃 〃 〃 وہ کسی رسّی کے ذریعے آسمان پر جائے اور مدد بند کرانے کی کوشش کر دیکھے۔

(۳) 〃 〃 〃 〃 〃 وہ آسمان پر جا کر وحی کا سلسلہ منقطع کرنے کی کوشش کر دیکھے۔

(۴) 〃 〃 〃 〃 〃 وہ آسمان پر جا کر رزق بند کرانے کی کوشش کر دیکھے۔

(۵) جس کا یہ خیال ہو کہ اللہ اس کی (یعنی خود اس طرح کا خیال کرنے والے کی) مدد نہ کریگا وہ اپنے گھر کی چھت سے رسی لٹکائے اور خودکشی کر لے۔

(۶) 〃 〃 〃 〃 〃 وہ آسمان تک پہنچ کر مدد لانے کی کوشش کر دیکھے۔

ان میں سے پہلے چار مفہومات تو بالکل ہی سیاق و سباق سے غیر متعلق ہیں۔ اور آخری دو مفہوم اگرچہ سیاق و سباق سے قریب تر ہیں، لیکن کلام کے ٹھیک مدعا تک نہیں پہنچتے۔ سلسلۂ تقریر کو نگاہ میں رکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ گمان کرنے والا شخص وہی ہے جو کنارے پر کھڑا ہو کر بندگی کرتا ہے، جب تک حالات اچھے رہتے ہیں، مطمئن رہتا ہے، اور جب کوئی آفت یا مصیبت آتی ہے، یا کسی ایسی حالت سے دوچار ہوتا ہے جو اسے ناگوار ہے، تو خدا سے پھر جاتا ہے اور ایک ایک آستانے پر ماتھا رگڑنے لگتا ہے۔ اس شخص کی یہ کیفیت کیوں ہے؟ اس لیے کہ وہ قضائے الٰہی پر راضی نہیں ہے، اور یہ سمجھتا ہے کہ قسمت کے بناؤ اور بگاڑ کے سررشتے اللہ کے سوا کسی اور کے ہاتھ میں بھی ہیں، اور اللہ سے مایوس ہو کر دوسرے آستانوں سے امیدیں وابستہ کرتا ہے۔ اس بنا پر فرمایا جا رہا ہے کہ جس شخص کے یہ خیالات ہوں وہ اپنا سارا زور لگا کر

شرک کیا،[۲۸] ان سب کے درمیان اللہ قیامت کے روز فیصلہ کر دے گا،[۲۹] ہر چیز اللہ کی نظر میں ہے۔ کیا تم

دیکھ لے، حتیٰ کہ اگر آسمان کو پھاڑ کر تھگلی لگا سکتا ہو تو وہ بھی کر کے دیکھ لے کہ آیا اس کی کوئی تدبیر تقدیر الٰہی کے کسی ایسے فیصلے کو بدل سکتی ہے جو اس کو ناگوار ہے۔ آسمان پر پہنچنے اور شگاف دینے سے مراد ہے وہ بڑی سے بڑی کوشش جس کا انسان تصور کر سکتا ہو۔ ان الفاظ کا کوئی لفظی مفہوم مراد نہیں ہے۔

۲۳؎ یعنی "مسلمان"، جنہوں نے اپنے اپنے زمانے میں خدا کے تمام انبیاء، اور اس کی کتابوں کو مانا، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جنہوں نے پچھلے انبیاء کے ساتھ آپ پر بھی ایمان لانا قبول کیا۔ ان میں صادق الایمان بھی شامل تھے اور وہ بھی تھے جو ماننے والوں میں شامل تو ہو جاتے تھے مگر "کنارے" پر رہ کر بندگی کرتے تھے اور کفر و ایمان کے درمیان مذبذب تھے۔

۲۴؎ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۳۵۷۔

۲۵؎ صابئی کے نام سے قدیم زمانے میں دو گروہ مشہور تھے۔ ایک حضرت یحیٰی علیہ السلام کے پیرو، جو بالائی عراق (یعنی الجزیرہ) کے علاقے میں اچھی خاصی تعداد میں پائے جاتے تھے، اور حضرت یحیٰی کی پیروی میں اصطباغ کے طریقے پر عمل کرتے تھے۔ دوسرے ستارہ پرست لوگ جو اپنے دین کو حضرت شیث اور حضرت ادریس علیہما السلام کی طرف منسوب کرتے تھے اور عناصر پر سیاروں کی اور سیاروں پر فرشتوں کی فرمانروائی کے قائل تھے۔ ان کا مرکز حرّان تھا اور عراق کے مختلف حصوں میں ان کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ دوسرا گروہ اپنے فلسفہ و سائنس اور فن طب کے کمالات کی وجہ سے زیادہ مشہور ہوا ہے۔ لیکن اغلب یہ ہے کہ یہاں پہلا گروہ مراد ہے۔ کیونکہ دوسرا گروہ غالباً نزول قرآن کے زمانے میں اس نام سے موسوم نہ تھا۔

۲۶؎ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اول، صفحہ ۴۵۵۔

۲۷؎ یعنی ایران کے آتش پرست جو روشنی اور تاریکی کے دو خدا مانتے تھے اور اپنے آپ کو زردشت کا پیرو کہتے تھے۔ ان کے مذہب و اخلاق کو مزدک کی گمراہیوں نے بری طرح مسخ کر کے رکھ دیا تھا، حتیٰ کہ سگی بہن سے نکاح تک ان میں رواج پا گیا تھا۔

۲۸؎ یعنی عرب اور دوسرے ممالک کے مشرکین جو مذکورۂ بالا گروہوں کی طرح کسی خاص نام سے موسوم نہ تھے۔ قرآن مجید ان کو دوسرے گروہوں سے ممیز کرنے کے لیے "مشرکین" اور "اَلَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا" کے اصطلاحی ناموں سے یاد کرتا ہے، اگرچہ

دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ کے آگے سربسجود ہیں[۳۰] وہ سب جو آسمانوں میں ہیں[۳۱] اور جو زمین میں ہیں، سورج اور چاند اور تارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت سے انسان[۳۲] اور بہت سے وہ لوگ بھی جو عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں[۳۳]۔ اور جسے اللہ ذلیل و خوار کر دے اُسے پھر کوئی عزت دینے والا نہیں ہے[۳۴]، اللہ کرتا ہے

اہلِ ایمان کے سوا باقی سب کے ہی عقائد و اعمال میں شرک داخل ہو چکا تھا۔

۲۹؎ یعنی خدا کے بارے میں مختلف انسانی گروہوں کے درمیان جو جھگڑا ہے اُس کا فیصلہ اس دنیا میں نہیں ہوگا بلکہ قیامت کے روز ہوگا۔ وہیں اس بات کا دوٹوک فیصلہ کر دیا جائے گا کہ ان میں سے کون حق پر ہے اور کون باطل پر۔ اگرچہ ایک معنی کے لحاظ سے یہ فیصلہ اس دنیا میں بھی خدا کی کتابیں کرتی رہی ہیں، لیکن یہاں فیصلے کا لفظ "جھگڑا چکانے" اور فریقین کے درمیان عدالت کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے جبکہ ایک کے حق میں اور دوسرے کے خلاف باقاعدہ ڈگری دے دی جائے۔

۳۰؎ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۴۵۱، ۵۴۵۔

۳۱؎ یعنی فرشتے، اجرامِ فلکی، اور وہ سب مخلوقات جو زمین کے ماوراء دوسرے جہانوں میں ہیں، خواہ وہ انسان کی طرح ذی عقل و ذی اختیار ہوں، یا حیوانات، نباتات، جمادات اور ہوا اور روشنی کی طرح بے عقل و بے اختیار۔

۳۲؎ یعنی وہ جو محض مجبوراً ہی نہیں بلکہ بالارادہ اور بطوع و رغبت بھی اُس کو سجدہ کرتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں دوسرا انسانی گروہ، جس کا بعد کے فقرے میں ذکر آ رہا ہے، وہ ہے جو اپنے ارادے سے خدا کے آگے جھکنے سے انکار کرتا ہے، مگر دوسری بے اختیار مخلوقات کی طرح وہ بھی قانونِ فطرت کی گرفت سے آزاد نہیں ہے اور سب کے ساتھ مجبوراً سجدہ کرنے والوں میں شامل ہے۔ اُس کے مستحق عذاب ہونے کی وجہ یہی ہے کہ وہ اپنے دائرۂ اختیار میں بغاوت کی روش اختیار کرتا ہے۔

۳۳؎ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ ان مختلف گروہوں کے جھگڑے کا فیصلہ تو قیامت ہی کے روز چکایا جائے گا، لیکن کوئی آنکھیں رکھتا ہو تو وہ آج بھی دیکھ سکتا ہے کہ حق پر کون ہے اور آخری فیصلہ کس کے حق میں ہونا چاہیے۔ پوری کائنات کا نظام اس بات پر شاہد ہے کہ زمین سے آسمانوں تک ایک ہی خدا کی خدائی پورے زور اور پوری ہمہ گیری

جو کچھ چاہتا ہے۔[۳۵]

یہ دو فریق ہیں جن کے درمیان اپنے رب کے معاملے میں جھگڑا ہے[۳۶]۔ ان میں سے وہ لوگ جنہوں نے

کے ساتھ چل رہی ہے۔ زمین کے ایک ذرے سے لے کر آسمان کے بڑے بڑے سیاروں تک سب ایک قانون میں جکڑے ہوئے ہیں جس سے بال برابر بھی جنبش کرنے کا کسی کو یارا نہیں ہے۔ مومن تو خیر دل سے اس کے آگے سر جھکاتا ہے، مگر وہ دہریہ بھی جو اس کے وجود تک کا انکار کر رہا ہے اور وہ مشرک بھی جو ایک ایک بے اختیار ہستی کے آگے جھک رہا ہے، اُس کی اطاعت پر اُسی طرح مجبور ہے جس طرح ہوا اور پانی۔ کسی فرشتے، کسی جن، کسی نبی اور ولی، اور کسی دیوی یا دیوتا کے پاس خدائی کی صفات اور اختیارات کا ادنیٰ شائبہ تک نہیں ہے کہ اس کو الوہیت اور معبودیت کا مقام دیا جاسکے، یا خداوند عالم کا ہم جنس یا مثیل ٹھیرایا جاسکے۔ کسی قانون بے حاکم اور فطرت بے صانع اور نظام بے ناظم کے لیے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ اتنی بڑی کائنات کو وجود میں لاسکے اور باقاعدگی کے ساتھ خود ہی چلاتا رہے اور قدرت و حکمت کے وہ حیرت انگیز کرشمے دکھاسکے جو اس کائنات کے گوشے گوشے میں ہر طرف نظر آرہے ہیں۔ کائنات کی یہ کھلی کتاب سامنے ہوتے ہوئے بھی جو شخص انبیاء کی بات نہیں مانتا اور مختلف خود ساختہ عقیدے اختیار کرکے خدا کے بارے میں جھگڑتا ہے اس کا برسرِ باطل ہونا آج بھی اسی طرح ثابت ہے جس طرح قیامت کے روز ثابت ہوگا۔

[۳۴] یہاں ذلت اور عزت سے مراد حق کا انکار اور اس کی پیروی ہے، کیونکہ اس کا لازمی نتیجہ ذلت اور عزت ہی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ جو شخص کھلے کھلے اور روشن حقائق کو آنکھیں کھول کر نہ دیکھے، اور سمجھانے والے کی بات بھی سن کر نہ دے وہ خود ہی ذلت و خواری کو اپنے اوپر دعوت دیتا ہے، اور اللہ وہی چیز اس کے نصیب میں لکھ دیتا ہے جو اس نے خود مانگی ہے۔ پھر جب اللہ ہی نے اس کو پیروی حق کی عزت نہ دی تو اب کون ہے جو اس کو اس عزت سے سرفراز کرا دے۔

[۳۵] یہاں سجدۂ تلاوت واجب ہے، اور سورۂ حج کا یہ سجدہ متفق علیہ ہے۔ سجدۂ تلاوت کی حکمت اور اس کے احکام کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۱۱۵-۱۱۶۔

[۳۶] یہاں خدا کے بارے میں جھگڑا کرنے والے تمام گروہوں کو ان کی کثرت کے باوجود دو فریقوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ایک فریق وہ جو انبیاء کی بات مان کر خدا کی صحیح بندگی اختیار کرتا ہے۔ دوسرا وہ جو ان کی بات نہیں مانتا اور

کفر کیا اُن کے لیے آگ کے لباس کاٹے جا چکے ہیں[۳۷]، اُن کے سروں پر کھولتا ہُوا پانی ڈالا جائے گا جس سے ان کی کھالیں ہی نہیں پیٹ کے اندر کے حصے تک گل جائیں گے، اور ان کی خبر لینے کے لیے لوہے کے گرز ہونگے۔ جب کبھی وہ گھبرا کر جہنم سے نکلنے کی کوشش کریں گے پھر اُسی میں دھکیل دیئے جائیں گے کہ چکھو اب جلنے کی سزا کا مزہ ع۲ (دوسری طرف) جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے اُن کو اللہ ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہونگی۔ وہاں وہ سونے کے کنگنوں اور موتیوں سے آراستہ کیے جائیں گے[۳۸] اور ان کے لباس ریشم کے ہونگے۔ ان کو پاکیزہ بات قبول کرنے کی ہدایت بخشی گئی[۳۹] اور انہیں خدائے ستودہ صفات کا راستہ دکھایا گیا[۴۰]۔

کفر کی راہ اختیار کرتا ہے، خواہ اس کے اندر آپس میں کتنے ہی اختلافات ہوں اور اس کے کفر نے کتنی ہی مختلف صورتیں اختیار کر لی ہوں۔

۳۷؎ مستقبل میں جس چیز کا پیش آنا بالکل قطعی اور یقینی ہو اس کو زور دینے کے لیے اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ گویا وہ پیش آ چکی ہے۔ آگ کے کپڑوں سے مراد غالباً وہی چیز ہے جسے سورۂ ابراہیم کے آخری رکوع میں سَرَابِیۡلُھُمۡ مِّنۡ قَطِرَانٍ فرمایا گیا ہے۔ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۴۹۲۔

۳۸؎ اس سے یہ تصور دلانا مقصود ہے کہ اُن کو شاہانہ لباس پہنائے جائیں گے۔ نزولِ قرآن کے زمانے میں بادشاہ اور بڑے بڑے رئیس سونے اور جواہر کے زیور پہنتے تھے، اور خود ہمارے زمانے میں بھی اس کا رواج رہا ہے۔

۳۹؎ اگرچہ پاکیزہ بات کے الفاظ عام ہیں، مگر مراد ہے وہ کلمۂ طیبہ اور عقیدۂ صالحہ جس کو قبول کرنے کی بنا پر وہ مؤمن ہوئے۔

۴۰؎ جیسا کہ دیباچے میں بیان کیا گیا ہے، ہمارے نزدیک یہاں سُورے کا وہ حصّہ ختم ہو جاتا ہے جو مکی دَور میں نازل ہُوا تھا۔ اِس حصے کا مضمون اور اندازِ بیان وہی ہے جو مکی سورتوں کا ہُوا کرتا ہے، اور اس میں کوئی علامت بھی ایسی نہیں ہے جس کی بنا پر یہ شبہ کیا جا سکے کہ شاید یہ پورا حصہ، یا اس کا کوئی جُز مدینے میں نازل ہُوا ہو۔ صرف آیت ھٰذٰنِ خَصۡمٰنِ اخۡتَصَمُوۡا فِیۡ رَبِّھِمۡ (یہ دو فریق ہیں جن کے درمیان اپنے رب کے بارے میں جھگڑا ہے) کے متعلق بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت مدنی ہے لیکن اس قول کی بنیاد صرف یہ ہے کہ ان کے نزدیک ان دو

جن لوگوں نے کفر کیا[۴۲] اور جو (آج) اللہ کے راستے سے روک رہے ہیں اور اُس مسجدِ حرام کی زیارت میں مانع ہیں[۴۳] جسے ہم نے سب لوگوں کے لیے بنایا ہے، جس میں مقامی باشندوں اور باہر سے آنے والوں کے حقوق برابر ہیں[۴۴] (اُن کی روش یقیناً سزا کی مستحق ہے) ۔ اِس (مسجدِ حرام) میں جو بھی راستی سے

فریقین سے مراد جنگِ بدر کے فریقین ہیں، اور یہ کوئی مضبوط تاویل نہیں ہے۔ سیاق و سباق میں کہیں کوئی چیز ایسی نہیں پائی جاتی جو اس اشارے کو اس جنگ کے فریقین کی طرف پھیرتی ہو۔ الفاظ عام ہیں، اور سیاقِ عبارت صاف بتا رہا ہے کہ اس سے مراد کفر و ایمان کی اُس نزاعِ عام کے فریقین ہیں جو ابتدا سے چلی آرہی ہے اور قیامت تک جاری رہے گی۔ جنگِ بدر کے فریقین سے اس کا تعلق ہوتا تو اس کی جگہ سورۂ انفال میں تھی نہ کہ اس سورے میں اور اس سلسلۂ کلام میں۔ یہ طریقِ تفسیر اگر صحیح مان لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ قرآن کی آیات بالکل منتشر طریقہ پر نازل ہوئیں اور پھر اُن کو بلا کسی ربط و مناسبت کے بس یونہی جہاں چاہا لگا دیا گیا۔ حالانکہ قرآن کا نظمِ کلام خود اس نظریے کی سب سے بڑی تردید ہے۔

[۴۲] یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو ماننے سے انکار کر دیا۔ آگے کا مضمون صاف بتا رہا ہے کہ ان سے مراد کفارِ مکہ ہیں۔

[۴۳] یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیرووں کو حج اور عمرہ نہیں کرنے دیتے۔

[۴۴] یعنی جو کسی شخص یا خاندان یا قبیلے کی جائداد نہیں ہے، بلکہ وقفِ عام ہے اور جس کی زیارت سے روکنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔

یہاں فقہی نقطۂ نظر سے دو سوال پیدا ہوتے ہیں جن کے بارے میں فقہائے اسلام کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے ہیں:۔

اول یہ کہ مسجدِ حرام سے مراد کیا ہے؟ آیا صرف مسجد یا پورا حرمِ مکہ؟

دوم یہ کہ اس میں عاکف (رہنے والے) اور باد (باہر سے آنے والے) کے حقوق برابر ہونے کا کیا مطلب ہے؟

ایک گروہ کہتا ہے کہ اس سے مراد صرف مسجد ہے نہ کہ پورا حرم، جیسا کہ قرآن کے ظاہر الفاظ سے مترشح ہوتا ہے اور اس میں حقوق کے مساوی ہونے سے مراد عبادت کے حق میں مساوات ہے، جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

کے اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ یابنی عبد مناف من ولی منکم من امور الناس شیئاً فلا یمنعن احداً طاف بھذا البیت او صلی ایۃ ساعۃ شاء من لیل او نہار "اے اولاد عبد مناف، تم میں سے جو کوئی لوگوں کے معاملات پر کسی اقتدار کا مالک ہو اسے چاہیے کہ کسی شخص کو رات اور دن کے کسی وقت میں بھی خانۂ کعبہ کا طواف کرنے یا نماز پڑھنے سے منع نہ کرے"۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ مسجد حرام سے پورا حرم مراد لینا اور پھر وہاں جملہ حیثیات سے مقامی باشندوں اور باہر سے آنے والوں کے حقوق برابر قرار دینا غلط ہے۔ کیونکہ مکہ کے مکانات اور زمینوں پر لوگوں کے حقوقِ ملکیت و وراثت اور حقوقِ بیع و اجارہ اسلام سے پہلے قائم تھے اور اسلام کے بعد بھی قائم رہے، حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں صفوان بن اُمیّہ کا مکان مکہ میں جیل کی تعمیر کے لیے چار ہزار درہم میں خریدا گیا۔ لہٰذا یہ مساوات صرف عبادت ہی کے معاملہ میں ہے نہ کہ کسی اور چیز میں۔ یہ امام شافعی اور ان کے ہم خیال اصحاب کا قول ہے۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ مسجد حرام سے مراد پورا حرم ہے۔ اس کی پہلی دلیل یہ ہے کہ خود اس آیت میں جس چیز پر مشرکین مکہ کو ملامت کی گئی ہے وہ مسلمانوں کے حج میں مانع ہونا ہے، اور ان کے اس فعل کو یہ کہہ کر رد کیا گیا ہے کہ وہاں سب کے حقوق برابر ہیں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ حج صرف مسجد ہی میں نہیں ہوتا بلکہ صفا اور مروہ سے لے کر منیٰ، مزدلفہ، عرفات، سب مناسک حج کے مقامات ہیں۔ پھر قرآن میں ایک جگہ نہیں متعدد مقامات پر مسجد حرام بول کر پورا حرم مراد لیا گیا ہے۔ مثلاً فرمایا وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ "مسجد حرام سے روکنا اور اس کے باشندوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک ماہِ حرام میں جنگ کرنے سے بڑا گناہ ہے" (البقرہ۔ رکوع ۲۷)۔ ظاہر ہے کہ یہاں مسجد میں نماز پڑھنے والوں کو نکالنا نہیں بلکہ مکہ سے مسلمان باشندوں کو نکالنا مراد ہے۔ دوسری جگہ فرمایا ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ "یہ رعایت اس کے لیے ہے جس کے گھر والے مسجد حرام کے رہنے والے نہ ہوں" (البقرہ۔ رکوع ۲۴)۔ یہاں بھی مسجد حرام سے مراد پورا حرم مکہ ہے نہ کہ محض مسجد۔ لہٰذا مسجد حرام میں مساوات کو صرف مسجد میں مساوات تک محدود نہیں قرار دیا جا سکتا، بلکہ یہ حرم مکہ میں مساوات ہے۔

پھر یہ گروہ کہتا ہے کہ یہ مساوات صرف عبادت اور تعظیم و حرمت ہی میں نہیں ہے، بلکہ حرم مکہ میں تمام حقوق کے اعتبار سے ہے۔ یہ سرزمین خدا کی طرف سے وقفِ عام ہے لہٰذا اس پر اور اس کی عمارات پر کسی کے حقوقِ ملکیت

نہیں ہیں، ہر شخص ہر جگہ ٹھیر سکتا ہے، کوئی کسی کو نہیں روک سکتا اور نہ کسی بیٹھے ہوئے کو اٹھا سکتا ہے۔ اس کے ثبوت میں یہ لوگ بکثرت احادیث اور آثار پیش کرتے ہیں۔ مثلاً

عبداللہ بن عمرؓ کی روایت کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مکۃ مناخ لا تُبَاعُ رباعھا ولا تؤاجر بیوتہا، "مکہ مسافروں کے اترنے کی جگہ ہے، نہ اس کی زمینیں بیچی جائیں اور نہ اس کے مکان کرائے پر چڑھائے جائیں"۔

ابراہیم نخعی کی مرسل روایت کہ حضورؐ نے فرمایا مکۃ حرمہا اللہ لا یحل بیع رباعھا ولا اجارۃ بیوتہا "مکہ کو اللہ نے حرم قرار دیا ہے، اس کی زمین کو بیچنا اور اس کے مکانوں کا کرایہ وصول کرنا حلال نہیں ہے"۔ (واضح رہے کہ ابراہیم نخعی کی مرسلات حدیث مرفوع کے حکم میں ہیں، کیونکہ ان کا یہ قاعدہ مشہور و معروف ہے کہ جب وہ مرسل روایت کرتے ہیں تو دراصل عبداللہ بن مسعودؓ کے واسطے سے روایت کرتے ہیں)۔ مجاہد نے بھی تقریباً انہی الفاظ میں ایک روایت نقل کی ہے۔

علقمہ بن نَضلہ کی روایت کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ رضی اللہ عنہم کے زمانے میں مکے کی زمینیں سوائب (افتادہ زمینیں یا شاملات) سمجھی جاتی تھیں، جس کو ضرورت ہوتی وہ رہتا تھا اور جب ضرورت نہ رہتی دوسرے کو ٹھیرا دیتا تھا"۔

عبداللہ بن عمرؓ کی روایت کہ حضرت عمرؓ نے حکم دے دیا تھا کہ حج کے زمانے میں مکے کا کوئی شخص اپنا دروازہ بند نہ کرے۔ بلکہ مجاہد کی روایت تو یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے اہل مکہ کو اپنے مکانات کے صحن کھلے چھوڑ دینے کا حکم دے رکھا تھا اور ان پر دروازے لگانے سے منع کرتے تھے تاکہ آنے والا جہاں چاہے ٹھیرے۔ یہی روایت عطاء کی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ صرف سُہیل بن عمرو کو فاروق اعظمؓ نے صحن پر دروازے لگانے کی اجازت دی تھی کیونکہ ان کو تجارتی کاروبار کے سلسلے میں اپنے اونٹ وہاں بند کرنے ہوتے تھے۔

عبداللہ بن عمرؓ کا قول کہ جو شخص مکہ کے مکانات کا کرایہ وصول کرتا ہے وہ اپنا پیٹ آگ سے بھرتا ہے۔

عبداللہ بن عباسؓ کا قول کہ اللہ نے پورے حرم مکہ کو مسجد بنا دیا ہے جہاں سب کے حقوق برابر ہیں، مکہ والوں کو باہر والوں سے کرایہ وصول کرنے کا حق نہیں ہے۔

عمر بن عبدالعزیز کا فرمان امیر مکہ کے نام کہ مکے کے مکانات پر کرایہ نہ لیا جائے کیونکہ یہ حرام ہے۔

سورۃ

ہٹ کر ظلم کا طریقہ اختیار کرے گا[۴۴] اسے ہم دردناک عذاب کا مزا چکھائیں گے ع

ان روایات کی بنا پر بکثرت تابعین اس طرف گئے ہیں، اور فقہا میں سے امام مالک، امام ابوحنیفہ، سفیان ثوری، امام احمد بن حنبل، اور اسحاق بن راھویہ کی بھی یہی رائے ہے کہ اراضی مکّہ کی بیع، اور کم از کم موسم حج میں مکے کے مکانوں کا کرایہ جائز نہیں۔ البتہ بیشتر فقہاء نے مکّہ کے مکانات پر لوگوں کی ملکیت تسلیم کی ہے اور ان کی بحیثیت عمارت، نہ کہ بحیثیت زمین، بیع کو بھی جائز قرار دیتے ہیں۔

یہی مسلک کتاب اللہ و سنت رسول اللہ اور سنت خلفاء راشدین سے قریب تر معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمام دنیا کے مسلمانوں پر حج اس لیے فرض نہیں کیا ہے کہ یہ اہل مکّہ کے لیے آمدنی کا ذریعہ بنے اور جو مسلمان احساس فرض سے مجبور ہو کر وہاں جائیں انہیں وہاں کے مالکان زمین اور مالکان مکانات خوب کرائے وصول کر کر کے لوٹیں۔ وہ ایک وقف عام ہے تمام اہل ایمان کے لیے۔ اس کی زمین کسی کی ملک نہیں ہے۔ ہر زائر کو حق ہے کہ جہاں جگہ پائے ٹھیر جائے۔

[۴۴] اس سے ہر وہ فعل مراد ہے جو راستی سے ہٹا ہوا ہو اور ظلم کی تعریف میں آتا ہو، نہ کہ کوئی خاص فعل۔ اس طرح کے افعال اگرچہ ہر حال میں گناہ ہیں، مگر حرم میں ان کا ارتکاب زیادہ شدید گناہ ہے۔ مفسرین نے بلاضرورت قسم کھانے تک کو الحاد فی الحرم میں شمار کیا ہے اور اس آیت کا مصداق ٹھیرایا ہے۔ ان عام گناہوں کے علاوہ حرم کی حرمت کے متعلق جو خاص احکام ہیں ان کی خلاف ورزی بدرجۂ اولیٰ اس تعریف میں آتی ہے۔ مثلاً:

حرم کے باہر جس شخص نے کسی کو قتل کیا ہو، یا کوئی اور ایسا جرم کیا ہو جس پر حد لازم آتی ہو، اور پھر وہ حرم میں پناہ لے لے تو جب تک وہ وہاں رہے اس پر ہاتھ نہ ڈالا جائے گا۔ حرم کی یہ حیثیت حضرت ابراہیمؑ کے زمانے سے چلی آتی ہے اور فتح مکّہ کے روز صرف ایک ساعت کے لیے اٹھائی گئی، پھر ہمیشہ کے لیے قائم ہو گئی۔ قرآن کا ارشاد ہے وَمَن دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا، ”جو اس میں داخل ہو گیا وہ امن میں آگیا“۔ حضرت عمرؓ، عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن عباسؓ کے یہ اقوال معتبر روایات میں آتے ہیں کہ اگر ہم اپنے باپ کے قاتل کو بھی وہاں پائیں تو اسے ہاتھ نہ لگائیں۔ اسی لیے جمہور تابعین اور حنفیہ اور حنابلہ اور اہل الحدیث اس کے قائل ہیں کہ حرم کے باہر کیے ہوئے جرم کا قصاص حرم میں نہیں لیا جا سکتا۔

وہاں جنگ اور خونریزی حرام ہے۔ فتح مکّہ کے دوسرے روز جو خطبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا اس میں

یاد کرو وہ وقت جبکہ ہم نے ابراہیم کے لیے اِس گھر (خانۂ کعبہ) کی جگہ تجویز کی تھی (اس ہدایت کے ساتھ) کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو، اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام و رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھو، ۲۵ اور لوگوں کو حج کے لیے اذنِ عام دے دو کہ وہ تمہارے پاس ہر دور دراز مقام سے پیدل

آپ نے اعلان فرما دیا تھا کہ "لوگو، اللہ نے مکے کو ابتدائے آفرینش سے حرام کیا ہے اور یہ قیامت تک کے لیے اللہ کی حرمت سے حرام ہے۔ کسی شخص کے لیے، جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتا ہو، حلال نہیں ہے کہ یہاں کوئی خون بہائے۔" پھر آپ نے فرمایا کہ "اگر میری اس جنگ کو دلیل بنا کر کوئی شخص اپنے لیے یہاں خونریزی کو جائز ٹھیرائے تو اس سے کہو کہ اللہ نے اپنے رسول کے لیے اس کو جائز کیا تھا نہ کہ تمہارے لیے۔ اور میرے لیے بھی یہ صرف ایک دن کی ایک ساعت کے لیے حلال کیا گیا تھا، پھر آج اس کی حرمت اُسی طرح قائم ہو گئی جیسی کل تھی۔"

وہاں کے قدرتی درختوں کو نہیں کاٹا جا سکتا۔ نہ خود رَو گھاس اکھاڑی جا سکتی ہے، نہ پرندوں اور دوسرے جانوروں کا شکار کیا جا سکتا ہے، اور نہ شکار کی غرض سے وہاں کے جانور کو بھگایا جا سکتا ہے تاکہ حرم کے باہر اس کا شکار کیا جائے۔ اس سے صرف سانپ بچھو اور دوسرے موذی جانور مستثنیٰ ہیں۔ اور خود رو گھاس سے اِذخر اور خشک گھاس مستثنیٰ کی گئی ہے۔ ان امور کے متعلق صحیح احادیث میں صاف صاف احکام وارد ہوئے ہیں۔

وہاں کی گری پڑی چیز اٹھانا ممنوع ہے، جیسا کہ ابوداؤد میں آیا ہے کہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن لقطۃ الحاج، یعنی "آپ نے حاجیوں کی گری پڑی چیز اُٹھانے سے منع فرما دیا تھا۔"

وہاں جو شخص بھی حج یا عُمرے کی نیت سے آئے وہ احرام کے بغیر داخل نہیں ہو سکتا۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ دوسری کسی غرض سے داخل ہونے والے کے لیے بھی احرام باندھ کر جانا ضروری ہے یا نہیں۔ ابن عباس کا مذہب یہ ہے کہ کسی حال میں بلا احرام داخل نہیں ہو سکتے۔ امام احمد اور امام شافعی کا بھی ایک ایک قول اسی کا مؤید ہے۔ دوسرا مذہب یہ ہے کہ صرف وہ لوگ اِحرام کی قید سے مستثنیٰ ہیں جن کو بار بار اپنے کام کے لیے وہاں جانا آنا پڑتا ہو، باقی سب کو احرام بند جانا چاہیے۔ یہ امام احمد و شافعی کا دوسرا قول ہے۔ تیسرا مذہب یہ ہے کہ جو شخص میقاتوں کے حدود میں رہتا ہو وہ مکہ میں بلا احرام داخل ہو سکتا ہے۔ مگر جو حدودِ میقات سے باہر کا رہنے والا ہو وہ بلا احرام نہیں جا سکتا۔ یہ امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے۔

اور دور دراز کے مقامات سے دبلے اونٹوں پر سوار آئیں ۶؎، تاکہ وہ فائدے دیکھیں جو یہاں اُن کے لیے رکھے گئے ہیں ۷؎، اور چند مقرر دنوں

۵؎ بعض مفسرین نے "پاک رکھو" پر اس فرمان کو ختم کر دیا ہے جو حضرت ابراہیم کو دیا گیا تھا، اور "حج کے لیے اذنِ عام دے دو" کا خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مانا ہے۔ لیکن اندازِ کلام صاف بتا رہا ہے کہ یہ خطاب بھی حضرت ابراہیم ہی کی طرف ہے اور اُسی حکم کا ایک حصہ ہے جو اُن کو خانۂ کعبہ کی تعمیر کے وقت دیا گیا تھا۔ علاوہ بریں مقصودِ کلام بھی یہاں یہی بتانا ہے کہ اوّل روز ہی سے یہ گھر خدائے واحد کی بندگی کے لیے تعمیر کیا گیا تھا اور تمام خدا پرستوں کو یہاں حج کے لیے آنے کا اذنِ عام تھا۔

۶؎ اصل میں لفظ ضامر استعمال ہوا ہے جو خاص طور پر دُبلے اونٹوں کے لیے بولتے ہیں۔ اس سے اُن مسافروں کی تصویر کھینچنا مقصود ہے جو دور دراز مقامات سے چلے آ رہے ہوں اور راستے میں اُن کے اونٹ چارہ پانی نہ ملنے کی وجہ سے دبلے ہو گئے ہوں۔

۷؎ یہاں وہ حکم ختم ہوتا ہے جو ابتداءً حضرت ابراہیم کو دیا گیا تھا، اور آگے کا ارشاد اُس پر اضافہ ہے جو بطورِ تشریح مزید کیا گیا ہے۔ ہماری اس رائے کی وجہ یہ ہے کہ اس حصۂ کلام کا خاتمہ "اس قدیم گھر کا طواف کریں" پر ہوتا ہے، جو ظاہر ہے کہ تعمیرِ خانۂ کعبہ کے وقت نہ فرمایا گیا ہو گا۔ (حضرت ابراہیم کی تعمیرِ خانۂ کعبہ کے متعلق مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو، سورۂ بقرہ، رکوع ۱۵۔ آلِ عمران، رکوع ۱۰۔ ابراہیم، رکوع ۶)

۸؎ اس سے مراد صرف دینی فائدے ہی نہیں ہیں بلکہ دنیوی فائدے بھی ہیں۔ یہ اسی خانۂ کعبہ اور اس کے حج کی برکت تھی کہ حضرت ابراہیم کے زمانہ سے لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک ڈھائی ہزار برس کی مدت میں عربوں کو ایک مرکزِ وحدت حاصل رہا جس نے اُن کی عربیت کو قبائلیت میں بالکل گم ہو جانے سے بچائے رکھا۔ اس مرکز سے وابستہ ہونے اور حج کے لیے ہر سال ملک کے تمام حصوں سے آتے رہنے کی بدولت ان کی زبان ایک رہی، ان کی تہذیب ایک رہی، ان کے اندر عرب ہونے کا احساس باقی رہا، اور ان کو خیالات، معلومات اور تمدنی طریقوں کی اشاعت کے مواقع ملتے رہے۔ پھر یہ بھی اسی حج کی برکت تھی کہ عرب کی اس عام بدامنی میں کم از کم چار مہینے ایسے امن کے میسر آ جاتے تھے جن میں ملک کے ہر حصے کا آدمی سفر کر سکتا تھا اور تجارتی قافلے بھی بخیریت گزر سکتے تھے۔ اس لیے عرب کی معاشی زندگی کے لیے بھی حج ایک رحمت تھا۔ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اوّل صفحہ ۲۰۴ تا ۲۷۶،

میں اُن جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اُس نے انہیں بخشے ہیں،[۵۰۵] خود بھی کھائیں اور تنگ دست محتاج کو بھی دیں،[۵۰۶]

۵۰۵ - ۵۰۶ -

اسلام کے بعد حج کے دینی فائدوں کے ساتھ اس کے دنیوی فائدے بھی کئی گنے زیادہ ہو گئے۔ پہلے وہ صرف عرب کے لیے رحمت تھا۔ اب وہ ساری دنیا کے اہلِ توحید کے لیے رحمت ہو گیا۔

۵۰۵ جانوروں سے مراد مویشی جانور ہیں، یعنی اونٹ، گائے، بھیڑ، بکری، جیسا کہ سورۂ انعام رکوع ۱۷ میں بصراحت بیان ہوا ہے۔

اُن پر اللہ کا نام لینے سے مراد اللہ کے نام پر، اور اُس کا نام لے کر انہیں ذبح کرنا ہے، جیسا کہ بعد کا فقرہ خود بتا رہا ہے۔ قرآن مجید میں قربانی کے لیے بالعموم "جانور پر اللہ کا نام لینے" کا استعارہ استعمال کیا گیا ہے، اور ہر جگہ اس سے مراد اللہ کے نام پر جانور کو ذبح کرنا ہی ہے۔ اس طرح گویا اس حقیقت پر متنبہ کیا گیا ہے کہ اللہ کا نام لیے بغیر، یا اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر جانور کو ذبح کرنا کفار و مشرکین کا طریقہ ہے۔ مسلمان جب کبھی جانور کو ذبح کرے گا اللہ کا نام لے کر کرے گا، اور جب کبھی قربانی کرے گا اللہ کے لیے کرے گا۔

ایام معلومات (چند مقرر دنوں) سے مراد کون سے دن ہیں؟ اس میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ان سے مراد ذی الحجہ کے پہلے دس دن ہیں۔ ابن عباس، حسن بصری، ابراہیم نخعی، قتادہ اور متعدد دوسرے صحابہ و تابعین سے یہ قول منقول ہے۔ امام ابو حنیفہؒ بھی اسی طرف گئے ہیں۔ امام شافعی اور امام احمد کا بھی ایک قول اس کی تائید میں ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد یوم النحر (یعنی ۱۰ ذی الحجہ) اور اس کے بعد کے تین دن ہیں۔ اس کی تائید میں ابن عباس، ابن عمر، ابراہیم نخعی، حسن اور عطاء کے اقوال پیش کیے جاتے ہیں، اور امام شافعی و احمد سے بھی ایک ایک قول اس کے حق میں منقول ہوا ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد تین دن ہیں، یوم النحر اور دو دن اس کے بعد۔ اس کی تائید میں حضرات عمر، علی، ابن عمر، ابن عباس، انس بن مالک، ابو ہریرہ، سعید بن مُسیّب اور سعید بن جُبیر کے اقوال منقول ہوئے ہیں۔ فقہاء میں سے سُفیان ثوری، امام مالک، امام ابو یوسف اور امام محمد نے یہی قول اختیار کیا ہے اور مذہب حنفی و مالکی میں اسی پر فتویٰ ہے۔ باقی کچھ شاذ اقوال بھی ہیں، مثلاً کسی نے یکم محرم تک قربانی کے ایام کو دراز کیا ہے، کسی نے صرف یوم النحر تک اسے محدود کر دیا ہے، اور کسی نے یوم النحر کے بعد صرف ایک دن مزید

پھر اپنا میل کچیل دور کریں[۵۱] اور اپنی نذریں پوری کریں[۵۲]، اور اس قدیم گھر کا طواف کریں[۵۳]۔

قربانی کا دن مانا ہے۔ لیکن یہ کمزور اقوال ہیں جن کی دلیل مضبوط نہیں ہے۔

[۵۰] بعض لوگوں نے اس ارشاد کا یہ مطلب لیا ہے کہ کھانا اور کھلانا دونوں واجب ہیں، کیونکہ حکم بصیغۂ امر دیا گیا ہے۔ دوسرا گروہ اس طرف گیا ہے کہ کھانا مستحب ہے اور کھلانا واجب۔ یہ رائے امام شافعی اور امام مالک کی ہے۔ تیسرا گروہ کہتا ہے کہ کھانا اور کھلانا دونوں مستحب ہیں۔ کھانا اس لیے مستحب ہے کہ جاہلیت کے زمانے میں لوگ اپنی قربانی کا گوشت خود کھانا ممنوع سمجھتے تھے، اور کھلانا اس لیے پسندیدہ کہ اس میں غریبوں کی امداد و اعانت ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔ ابن جریر نے حسن بصری، عطاء، مجاہد اور ابراہیم نخعی کے یہ اقوال نقل کیے ہیں کہ فکلوا منھا میں صیغۂ امر کے استعمال سے کھانے کا وجوب ثابت نہیں ہوتا۔ یہ امر ویسا ہی ہے جیسے فرمایا وَإِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوا "جب تم حالتِ احرام سے نکل آؤ تو پھر شکار کرو" (المائدہ۔ رکوع ۱) اور فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ "پھر جب نماز ختم ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ" (الجمعہ۔ رکوع ۲)۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ احرام سے نکل کر شکار کرنا اور نمازِ جمعہ کے بعد زمین میں پھیل جانا واجب ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ پھر ایسا کرنے میں کوئی چیز مانع نہیں ہے۔ اسی طرح یہاں بھی چونکہ لوگ اپنی قربانی کا گوشت خود کھانے کو ممنوع سمجھتے تھے، اس لیے فرمایا گیا کہ نہیں، اسے کھاؤ، یعنی اس کی کوئی ممانعت نہیں ہے۔

تنگ دست فقیر کو کھلانے کے متعلق جو فرمایا گیا ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ غنی کو نہیں کھلایا جا سکتا۔ دوست، ہمسائے، رشتہ دار، خواہ محتاج نہ ہوں، پھر بھی انہیں قربانی کے گوشت میں سے دینا جائز ہے۔ یہ بات صحابۂ کرام کے عمل سے ثابت ہے۔ علقمہ کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود نے میرے ہاتھ قربانی کے جانور بھیجے اور ہدایت فرمائی کہ یوم النحر کو انہیں ذبح کرنا، خود بھی کھانا، مساکین کو بھی دینا، اور میرے بھائی کے گھر بھی بھیجنا۔ ابن عمر کا بھی یہی قول ہے کہ ایک حصہ کھاؤ، ایک حصہ ہمسایوں کو دو، اور ایک حصہ مساکین میں تقسیم کرو۔

[۵۱] یعنی مناسک حج سے فارغ ہو کر احرام کھول دیں، حجامت کرائیں، نہائیں دھوئیں اور وہ پابندیاں ختم کر دیں جو احرام کی حالت میں عائد ہو گئی تھیں۔ لغت میں تفث کے اصل معنی اس غبار اور میل کچیل کے ہیں جو سفر میں آدمی پر چڑھ جاتا ہے۔ مگر حج کے سلسلے میں جب میل کچیل دور کرنے کا ذکر کیا گیا ہے تو اس کا مطلب وہی لیا جائے گا

یہ تھا (تعمیر کعبہ کا مقصد) اور جو کوئی اللہ کی قائم کردہ حرمتوں کا لحاظ کرے تو یہ اس کے رب کے ہاں خود اسی کے لیے بہتر ہوگا۔[۵۴]

اور تمہارے لیے مویشی جانور حلال کیے گئے،[۵۵] ماسوا اُن چیزوں کے جو تمہیں بتائی جا چکی ہیں۔[۵۶] پس

جو اوپر بیان ہوا ہے۔ کیونکہ حاجی جب تک مناسکِ حج اور قربانی سے فارغ نہ ہو جائے، وہ نہ بال ترشوا سکتا ہے، نہ ناخن کٹوا سکتا ہے، اور نہ جسم کی دوسری صفائی کر سکتا ہے۔

۵۲ یعنی جو نذر بھی کسی نے اس موقع کے لیے مانی ہو۔

۵۳ کعبہ کے لیے "بیتِ عتیق" کا لفظ بہت معنی خیز ہے۔ "عتیق" عربی زبان میں تین معنوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ایک، قدیم۔ دوسرے آزاد جس پر کسی کی ملک نہ ہو۔ تیسرے مکرم اور معزز۔ یہ تینوں ہی معنی اس پاک گھر پر صادق آتے ہیں۔

طواف سے مراد طوافِ افاضہ، یعنی طوافِ زیارت ہے جو یوم النحر کو کیا جاتا ہے۔ یہ ارکانِ حج میں سے ہے اور چونکہ قضائے تفث کے حکم سے متصل اس کا ذکر کیا گیا ہے اس لیے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اس سے مراد طوافِ افاضہ ہی ہے۔ حج کی تکمیل اسی طواف سے ہوتی ہے۔

۵۴ بظاہر یہ ایک عام نصیحت ہے جو اللہ کی قائم کی ہوئی تمام حرمتوں کا احترام کرنے کے لیے فرمائی گئی ہے، مگر اس سلسلۂ کلام میں وہ حرمتیں بدرجۂ اولیٰ مراد ہیں جو مسجد حرام اور حج اور عمرے اور حرمِ مکہ کے باب میں قائم کی گئی ہیں۔ نیز اس میں ایک لطیف اشارہ اس طرف بھی ہے کہ قریش نے حرم سے مسلمانوں کو نکال کر اور ان پر حج کا راستہ بند کر کے اور مناسکِ حج میں مشرکانہ و جاہلانہ رسمیں شامل کر کے اور بیت اللہ کو شرک کی گندگی سے ملوث کر کے اُن بہت سی حرمتوں کی ہتک کر ڈالی ہے جو ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے قائم کر دی گئی تھیں۔

۵۵ اس موقع پر مویشی جانوروں کی حلت کا ذکر کرنے سے مقصود دو غلط فہمیوں کو رفع کرنا ہے۔ اول یہ کہ قریش اور مشرکین عرب بحیرہ اور سائبہ اور وصیلہ اور حام کو بھی اللہ کی قائم کی ہوئی حرمتوں میں شمار کرتے تھے، اس لیے فرمایا گیا کہ یہ اس کی قائم کردہ حرمتیں نہیں ہیں، بلکہ اس نے تمام مویشی جانور حلال کیے ہیں۔ دوم یہ کہ حالتِ احرام میں جس طرح شکار حرام ہے اُس طرح کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ مویشی جانوروں کا ذبح کرنا اور ان کو کھانا بھی حرام ہے۔

بتوں کی گندگی سے بچو،۵۵ جھوٹی باتوں سے پرہیز کرو،۵۶ یکسو ہو کر اللہ کے بندے بنو، اس کے ساتھ کسی کو

اس لیے بتایا گیا کہ یہ اللہ کی قائم کی ہوئی حرمتوں میں سے نہیں ہے۔

۵۴؎ اشارہ ہے اُس حکم کی طرف جو سورۂ نحل میں ارشاد ہوا ہے کہ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ "تم پر حرام کیا گیا ہے مردار اور خون اور سؤر کا گوشت اور وہ جو اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا جائے" (رکوع ۱۵)۔

۵۵؎ یعنی بتوں کی پرستش سے اس طرح بچو جیسے غلاظت سے آدمی گھن کھاتا ہے اور دُور ہٹتا ہے۔ گویا کہ وہ نجاست سے بھرے ہوئے ہیں اور قریب جاتے ہی آدمی اُن سے نجس اور پلید ہو جائے گا۔

۵۶؎ اگرچہ الفاظ عام ہیں، اور ان سے ہر جھوٹ، بہتان، اور جھوٹی شہادت کی حرمت ثابت ہوتی ہے، مگر اس سلسلۂ کلام میں خاص طور پر اشارہ اُن باطل عقائد اور احکام اور رسوم اور اوہام کی طرف ہے جن پر کفر و شرک کی بنیاد ہے۔ اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھیرانا اور اس کی ذات، صفات، اختیارات اور حقوق میں اس کے بندوں کو حصہ دار بنانا وہ سب سے بڑا جھوٹ ہے جس سے یہاں منع کیا گیا ہے۔ اور پھر وہ جھوٹ بھی اس فرمان کی براہِ راست زد میں آتا ہے جس کی بنا پر مشرکین عرب بحیرہ اور سائبہ اور حام وغیرہ کو حرام قرار دیتے تھے، جیسا کہ سورۂ نحل میں فرمایا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ "اور یہ جو تمہاری زبانیں جھوٹے احکام لگایا کرتی ہیں کہ یہ حلال ہے اور وہ حرام، تو اس طرح کے حکم لگا کر اللہ پر جھوٹ نہ باندھا کرو" (رکوع ۱۵)

اس کے ساتھ جھوٹی قسم اور جھوٹی شہادت بھی اسی حکم کے تحت آتی ہے، جیسا کہ صحیح احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا عُدِلَت شهادة الزور بالاشراك بالله "جھوٹی گواہی شرک باللہ کے برابر رکھی گئی ہے"، اور پھر آپ نے ثبوت میں یہی آیت پیش فرمائی۔ اسلامی قانون میں یہ جرم مستلزم تعزیر ہے۔ امام ابو یوسف اور محمد کا فتویٰ یہ ہے کہ اس کی تشہیر کی جائے اور لمبی قید کی سزا دی جائے۔ یہی حضرت عمرؓ کا قول اور فعل بھی ہے۔ مکحول کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا يضرب ظهره ويحلق رأسه ويسخم وجهه ويطال حبسه "اس کی پیٹھ پر کوڑے مارے جائیں، اس کا سر مونڈا جائے اور منہ کالا کیا جائے اور لمبی قید

شریک نہ کرو۔ اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کرے تو گویا وہ آسمان سے گر گیا؛ اب یا تو اسے پرندے اچک لے جائیں گے یا ہوا اُس کو ایسی جگہ لے جا کر پھینک دے گی جہاں اُس کے چیتھڑے اُڑ جائیں گے۔[۵۹] یہ ہے اصل معاملہ (اسے سمجھ لو)، اور جو اللہ کے مقرر کردہ شعائر[۶۰] کا احترام کرے تو یہ دلوں کے

کی سزا دی جاتی۔ عبداللہ بن عامر اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی عدالت میں ایک شخص کی گواہی جھوٹی ثابت ہو گئی تو انہوں نے اُس کو ایک دن بر سرِ عام کھڑا رکھ کر اعلان کرایا کہ یہ فلاں بن فلاں جھوٹا گواہ ہے اسے پہچان لو، پھر اس کو قید کر دیا۔ موجودہ زمانے میں ایسے شخص کا نام اخبارات میں نکال دینا تشہیر کا مقصد پورا کر سکتا ہے۔

۵۹ اس تمثیل میں آسمان سے مراد ہے انسان کی فطری حالت جس میں وہ ایک خدا کے سوا کسی کا بندہ نہیں ہوتا اور توحید کے سوا اُس کی فطرت کسی اور مذہب کو نہیں جانتی۔ اگر انسان انبیاء کی دی ہوئی رہنمائی قبول کرلے تو وہ اسی فطری حالت پر علم اور بصیرت کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے، اور آگے اس کی پرواز مزید بلندیوں ہی کی طرف ہوتی ہے نہ کہ پستیوں کی طرف۔ لیکن شرک (اور صرف شرک ہی نہیں بلکہ دہریت اور الحاد بھی) اختیار کرتے ہی وہ اپنی فطرت کے آسمان سے یکایک گر پڑتا ہے اور پھر اس کو دو صورتوں میں سے کوئی ایک صورت لازماً پیش آتی ہے۔ ایک یہ کہ شیاطین اور گمراہ کرنے والے انسان، جن کو اس تمثیل میں شکاری پرندوں سے تشبیہ دی گئی ہے اس کی طرف جھپٹتے ہیں اور ہر ایک اسے اُچک لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کی اپنی خواہشاتِ نفس اور اس کے اپنے جذبات اور تخیلات، جن کو ہوا سے تشبیہ دی گئی ہے، اسے اڑائے اڑائے لیے پھرتے ہیں اور آخر کار اس کو کسی گہرے کھڈ میں لے جا کر پھینک دیتے ہیں۔

سَحِیق کا لفظ سحق سے نکلا ہے جس کے اصل معنی پیسنے کے ہیں۔ کسی جگہ کو سحیق اُس صورت میں کہیں گے جبکہ وہ اتنی گہری ہو کہ جو چیز اس میں گرے وہ پاش پاش ہو جائے۔ یہاں فکر و اخلاق کی پستی کو اس گہرے کھڈ سے تشبیہ دی گئی ہے جس میں گر کر آدمی کے پرزے اُڑ جائیں۔

۶۰ یعنی خدا پرستی کی علامات، خواہ وہ اعمال ہوں جیسے نماز، روزہ، حج وغیرہ، یا اشیاء ہوں جیسے مسجد اور ھدی کے اونٹ وغیرہ۔ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اول، صفحہ ۴۳۰ - ۴۲۹

تقویٰ سے ہے۔[61]

تمہیں ایک وقت مقرر تک اُن (ہدی کے جانوروں) سے فائدہ اُٹھانے کا حق ہے،[62] پھر اُن

[61] یعنی یہ احترام دل کے تقویٰ کا نتیجہ ہے اور اس بات کی علامت ہے کہ آدمی کے دل میں کچھ نہ کچھ خدا کا خوف ہے جبھی تو وہ اس کے شعائر کا احترام کر رہا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اگر کوئی شخص جان بوجھ کر شعائر اللہ کی ہتک کرے تو یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ اس کا دل خدا کے خوف سے خالی ہو چکا ہے، یا تو وہ خدا کا قائل ہی نہیں ہے، یا ہے تو اس کے مقابلے میں باغیانہ روش اختیار کرنے پر اتر آیا ہے۔

[62] پہلی آیت میں شعائر اللہ کے احترام کا عام حکم دینے اور اسے دل کے تقویٰ کی علامت ٹھیرانے کے بعد یہ فقرہ ایک غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے ارشاد فرمایا گیا ہے۔ شعائر اللہ میں ہدی کے جانور بھی داخل ہیں، جیسا کہ اہلِ عرب مانتے تھے اور قرآن خود بھی آگے چل کر کہتا ہے کہ وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ "اور ان ہدی کے اونٹوں کو ہم نے تمہارے لیے شعائر اللہ میں شامل کیا ہے"۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ شعائر اللہ کی تعظیم کا جو حکم اوپر دیا گیا ہے کیا اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہدی کے جانوروں کو بیت اللہ کی طرف جب لے جانے لگیں تو ان کو کسی طرح بھی استعمال نہ کیا جائے؟ ان پر سواری کرنا، یا سامان لادنا، یا ان کے دودھ پینا تعظیم شعائر اللہ کے خلاف تو نہیں ہے؟ عرب کے لوگوں کا یہی خیال تھا۔ چنانچہ وہ ان جانوروں کو بالکل کوتل لے جاتے تھے۔ راستے میں ان سے کسی طرح کا فائدہ اٹھانا اُن کے نزدیک گناہ تھا۔ اِسی غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ قربانی کی جگہ پہنچنے تک تم ان جانوروں سے فائدہ اُٹھا سکتے ہو، ایسا کرنا تعظیم شعائر اللہ کے خلاف نہیں ہے۔ یہی بات اُن احادیث سے معلوم ہوتی ہے جو اس مسئلے میں حضرت ابو ہریرہ اور حضرت انس سے مروی ہیں۔ ان میں بیان ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ایک شخص اونٹ کی مہار تھامے پیدل چلا جا رہا ہے اور سخت تکلیف میں ہے۔ آپ نے فرمایا اس پر سوار ہو جا۔ اس نے عرض کیا یہ ہدی کا اونٹ ہے۔ آپ نے فرمایا "ارے سوار ہو جا"۔

مفسرین میں سے ابن عباس، قتادہ، مجاہد، ضحاک اور عطاء خراسانی اس طرف گئے ہیں کہ اس آیت میں "ایک وقت مقرر تک" سے مراد "جب تک کہ جانور کو قربانی کے لیے نامزد اور ہدی سے موسوم نہ کر دیا جائے" ہے۔ اس تفسیر کی رُو سے آدمی ان جانوروں سے صرف اس وقت تک فائدہ اٹھا سکتا ہے جب تک کہ وہ اسے ہدی

(کے قربان کرنے) کی جگہ اسی قدیم گھر کے پاس ہے[۶۳] ع

ع

کے نام سے موسوم نہ کرے، اور جونہی کہ وہ اسے ہدی بنا کر بیت اللہ لے جانے کی نیت کر لے، پھر اسے کوئی فائدہ اٹھانے کا حق نہیں رہتا لیکن یہ تفسیر کسی طرح صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ اول تو اس صورت میں استعمال اور استفادے کی اجازت دینا ہی بے معنی ہے، کیونکہ "ہدی" کے سوا دوسرے جانوروں سے استفادہ کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں کوئی شک پیدا ہی کب ہوا تھا کہ اسے اجازت کی تصریح سے رفع کرنے کی ضرورت پیش آتی پھر آیت صریح طور پر کہہ رہی ہے کہ اجازت اُن جانوروں کے استعمال کی دی جا رہی ہے جن پر "شعائر اللہ" کا اطلاق ہو، اور ظاہر ہے کہ یہ صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے جبکہ انہیں ہدی قرار دے دیا جائے۔

دوسرے مفسرین، مثلاً عروہ بن زبیر اور عطاء بن ابی رباح کہتے ہیں کہ "وقتِ مقرر" سے مراد "قربانی کا وقت" ہے۔ قربانی سے پہلے ہدی کے جانوروں کو سواری کے لیے بھی استعمال کر سکتے ہیں، ان کے دودھ بھی پی سکتے ہیں، اُن کے بچے بھی لے سکتے ہیں اور ان کا اُون، صوف، بال وغیرہ بھی اتار سکتے ہیں۔ امام شافعی نے اسی تفسیر کو اختیار کیا ہے۔ حنفیہ اگرچہ پہلی تفسیر کے قائل ہیں، لیکن وہ اس میں اتنی گنجائش نکال دیتے ہیں کہ بشرطِ ضرورت استفادہ جائز ہے۔

[۶۳] جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ (المائدہ۔ رکوع ۱۳)۔ اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ کعبہ پر، یا مسجدِ حرام میں قربانی کی جائے، بلکہ حرم کے حدود میں قربانی کرنا مراد ہے۔ یہ ایک اور دلیل ہے اس امر کی کہ قرآن کعبہ، یا بیت اللہ، یا مسجد حرام بول کر بالعموم حرمِ مکہ مراد لیتا ہے نہ کہ صرف وہ عمارت۔

اسلام اور ہمارا قانونی نظام

(عبد القادر عودہ شہیدؒ)

(۴)

فرانسیسی انقلاب اور قوانینِ یورپ اس میں شک نہیں کہ فرانسیسی انقلاب سے پہلے یورپ میں وضعی قوانین کو ایک حد تک غلبہ اور بالادستی حاصل تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان قوانین میں اخلاقی اصول اور دینی عقائد کی خاصی آمیزش تھی۔ اہلِ روما کے عہدِ قدیم سے اوامر و نواہی، عادات و اخلاق، احکامِ دینیہ اور عدالتی نظائر کی ایک معتدبہ مقدار متوارث چلی آ رہی تھی اور تسلسل کے ساتھ ان پر عمل درآمد ہوتا چلا آیا تھا۔ انقلابِ فرانس کے بعد یورپ کے قانون سازوں نے قانون کی ان دیرینہ بنیادوں کو منہدم کرنا شروع کر دیا اور زیادہ تر مادی افادیت، ظاہری امن و امان اور نظم و نسق کو قانون کی بنا قرار دے دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قانون کا باطنی اور روحانی پہلو بہت بودا اور کمزور ہو گیا اور افراد و اقوام کے قلوب قانون کی دسترس اور اُس کے تسلط سے باہر ہو گئے۔ دین، عقائد اور اخلاق سے بے اعتنائی کے لازمی ثمرات یہ تھے کہ انتشار، بدنظمی، سرکشی اور توہینِ قانون کی روش عام ہو گئی۔ آئے دن بغاوتیں اور انقلابات رونما ہونے لگے اور انسان کی زندگی سے امن، سکون اور اطمینان آہستہ آہستہ رخصت ہو گیا۔

قانون کے استخفاف کی اصل وجہ قوانینِ جدیدہ کی اہانت اور بے حرمتی کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ انقلابِ فرانس کے وقت جن خوش آئند نظریات کا صور بڑے زور سے پھونکا گیا تھا ان میں سے ایک نظریہ انسانی مساوات کا اور دوسرا عقیدے کی حریت کا تھا۔ ان دونوں نظریات کو آپس میں جمع کرنے اور تطبیق دینے کی جو شکل اُس وقت قانون سازوں کی سمجھ میں آئی وہ یہ تھی کہ قانون اور عقیدے میں کسی طرح کا علاقہ باقی نہ رہنے دیا۔ یہ لوگ دراصل اس خام خیالی میں مبتلا تھے کہ اگر عقیدہ و قانون

کے باہمی ربط و تعلق کو برقرار رہنے دیا گیا تو یہ صورتِ حال آزادئ فکر و عقیدہ کے منافی ہوگی اور اس کی وجہ سے مختلف العقیدہ گروہوں کے مابین قانونی مساوات بھی قائم نہیں ہو سکے گی۔ اس غلط فہمی کا یہ افسوسناک نتیجہ رونما ہوا کہ قانون کو کلیۃً غیر اخلاقی بنیادوں پر استوار کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ کاش کہ اس پیچیدگی کو اس طرح سے حل کیا جاتا جس طرح سے کہ اسلام نے اسے حل کر کے دکھایا ہے۔ اس حل سے اصل مقصد بھی فوت نہ ہونے پاتا اور مضر نتائج بھی برآمد نہ ہوتے۔

مسئلہ مذکورہ کا اسلامی حل | یہ امر تو معلوم ہی ہے کہ قوانینِ اسلام کی بنیاد شریعت پر رکھی گئی ہے اور یہ قوانین اپنی فطرت اور اصل کے اعتبار سے لادینی نہیں بلکہ دینی قوانین ہیں۔ اسلام میں یہ اصول بھی مسلّم ہے کہ اس کے قوانین کا نفاذ مسلمانوں پر بھی ہوتا ہے اور ان غیر مسلم ذمیوں پر بھی ہوتا ہے جو دارالاسلام میں متوطن ہو کر اس کی شہریت قبول کر لیں۔ دوسری طرف مساوات اور حریتِ فکر بھی اسلام کے مانے ہوئے معروف اصولوں میں شامل ہیں۔ بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو اسلامی مملکت ذمی شہریوں کے وجود پر مشتمل ہوگی اُسے اسی مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا جس مشکل کا سامنا یورپ کے واضعینِ قانون کو کرنا پڑا تھا اور اسلامی قانون کے راستے میں بھی وہی ناقابلِ تسخیر چٹان حائل ہو جائے گی جس سے ٹکرا کر یورپ کے دینی و اخلاقی قوانین پاش پاش ہو گئے۔ اسلام نے اس الجھن کا ایک نہایت سیدھا سادا اور نہایت عمدہ حل تجویز کیا ہے۔ اُس نے خیالی دنیا میں خوشنما نظریات کے بجائے واقعات کو ان کی اصلی شکل میں دیکھا ہے اور ان کا عملی حل انسان کے سامنے رکھا ہے۔ اُس نے قانون کے اطلاق میں یہ اصول رکھا ہے کہ جن معاملات و حیثیات میں مسلم و غیر مسلم برابر ہیں ان میں دونوں پر ایک ہی قانون نافذ کیا ہے اور جن اعتبارات میں وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں وہاں ان کے لیے قانون بھی مختلف تجویز کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ جن عام انسانی اور اجتماعی حیثیتوں سے ایک مسلمان اور ایک ذمی برابر ہیں، ان تمام حیثیتوں میں انہیں ایک ہی آنکھ دیکھا جانا چاہیے۔ البتہ ان دونوں کے عقائد ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اس لیے جو قوانین عقائد سے متعلق ہونگے ان میں مساوات کا سوال ہی سرے سے پیدا نہیں ہوتا۔ جب عقائد ہی میں یکسانیت اور مساوات نہیں تو اس دائرے میں قانونی مساوات کے آخر کیا معنی ہو سکتے ہیں؟

واقعہ یہ ہے کہ ایک طرف اگر مساوی فریقین کے درمیان مساوات قائم کرنا صریح عدل کا تقاضا ہے، وہیں دوسری طرف غیر مساوی اور متخالف فریقین کو مساوات کے نام پر ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا خالص ظلم ہے۔ چنانچہ شریعت نے جو قاعدہ اس بارے میں مقرر کیا ہے وہ مساوات کے بنیادی اصول کے ہرگز خلاف نہیں ہے بلکہ وہ عین مساوات ہے کیونکہ مساوات کی اصل روح اور اس کا اصل منشاء عدل وانصاف ہی کا قیام ہے۔ عقائد دینیہ کے معاملے میں اگر مسلم و غیر مسلم سے یکساں قانونی سلوک روا رکھا جائے تو اس سے بڑھ کر زیادتی اور بے انصافی کیا ہو گی۔ کیونکہ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ان دونوں کو اپنے عقائد کے خلاف قوانین کی پیروی پر مجبور کیا جائے اور انہیں اپنے عقائد پر عمل کرنے کی آزادی سے محروم کر دیا جائے۔ اس طرح کے قوانین بنانا نص قرآنی لا اکراہ فی الدین کی کھلی ہوئی خلاف ورزی ہو گی۔

اس ضمن میں مسلم و غیر مسلم کے مابین جس طرح قانونی تفریق کی گئی ہے اُس کی ایک مثال شرب خمر اور اکل خنزیر ہے۔ اسلام میں ان دونوں افعال کا ارتکاب مسلمان کے لیے حرام ہے اور شریعت کی نگاہ میں ایسا کرنا قانونی جرم ہے۔ لیکن ایک غیر مسلم جس کے مذہب میں یہ افعال حرام نہیں ہیں، اُسے شریعت نے اس قانون سے مستثنیٰ کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اُس پر اس قانون کو نافذ کیا جائے تو یہ سراسر ظلم اور ناانصافی ہے۔ اسی طرح اگر مسلمانوں کو شراب پینے اور سور کھانے کی قانونی اجازت دے دی جائے تو یہ ان کے دینی عقائد کی صریح توہین ہے۔ اس مثال سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جن معاملات کا رابطہ عقائد سے ہے اُن کے بارے میں نفیاً یا اثباتاً اندھا دھند ایک ہی طرح کا قانون بنا دینا بالکل غلط اور دین و فطرت کے قطعی خلاف ہے۔ اسی طرح اگر دین سے قانون کے رشتے کو بالکل کاٹ دیا جائے تو یہ فعل بھی پورے قانونی نظام پر ایک کاری وار کے مترادف ہے کیونکہ اس کے بعد قانون اپنا اخلاقی جواز اور روحانی اثر و اقتدار بالکل کھو دیتا ہے۔

انسانی قوانین کی بدترین قسم گزشتہ بحث میں یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ قوانین شرعیہ کے مقابلے میں انسان کے بنائے ہوئے قوانین ہر لحاظ سے ناقص ہیں لیکن ان بشری قوانین میں سے بھی بدترین اور ناقص ترین قوانین وہ ہیں جنہیں بناتے وقت اُس قوم کے مفادات، خصوصیات اور روایات کو بھی

مدنظر نہیں رکھا جاتا جس قوم کے نام پر وہ قوانین وضع کیے جا رہے ہوتے ہیں۔ اس طرح کے قوانین کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ قومی افکار و نظریات، قومی اخلاق اور قومی خصائص و معروفات کی بھی عین ضد ہوتے ہیں۔ اگرچہ اس طرح کے قوانین کی پشت پر پوری طاقت موجود ہوتی ہے جو ان کا لوہا جمہور سے منوانے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے۔ لیکن ان قوانین کو کبھی تمکن، غلبہ اور قرار نصیب نہیں ہو سکتا۔ اور ہو بھی کیسے جبکہ وہ افراد کے عقائد سے متصادم ہوتے ہیں، ان کے اخلاق کو بگاڑتے ہیں اور ان کے قلب و ضمیر کو اذیت اور عذاب میں مبتلا رکھتے ہیں۔ اس طرح کے قوانین کے لیے عوام سے اطاعت کا مطالبہ کرنا اور اس کی توقع رکھنا بالکل عبث اور بیکار ہے۔ بلکہ اس قسم کے قانون کے بارے میں جس چیز کی بجا طور پر توقع کی جاسکتی ہے وہ یہ کہ عوام الناس کے اندر اس کے خلاف غم و غصہ اور عداوت کے جذبات ابھریں گے اور وہ اس طرح کے قانون اور اس کے حامیوں کو تہس نہس کر کے رکھ دیں گے۔ ایسے قوانین کی مخالفت کو جبر و تشدد کے ذریعے سے کبھی بھی نہیں دبایا جا سکتا۔ مادی طاقت کے ذریعے اس مزاحمت کو تو ختم کیا جا سکتا ہے جو صرف مادی وسائل کے ساتھ اور مادی اغراض کے تحت پیدا ہوئی ہو لیکن جو مزاحمت عقائد و افکار کے بل پر اور عقاید و افکار ہی کی خاطر رونما ہوئی ہو وہاں تو حال یہ ہو جاتا ہے کہ:

؎ بڑھتا ہے ذوقِ جرم یہاں ہر سزا کے بعد

بلادِ اسلامیہ کے قوانین قانون کی جس بدترین نوع کا ذکر اوپر گزرا ہے، مصر اور دوسرے اسلامی ممالک میں کم و بیش اسی قسم کے قوانین رائج ہیں۔ ہم اس سے پہلے واضح کر چکے ہیں کہ ان سے قانون کا اصل منشا اور مقصد ہی فوت ہو رہا ہے۔ ان کو ہمارے اصول و مصالح سے ادنیٰ تعلق بھی نہیں ہے اور ان کو ہماری جانب منسوب کرنا کسی لحاظ سے بھی صحیح نہیں ہے۔ نہ ہمارے دل و دماغ میں ان کے احترام کے لیے کوئی جگہ ہے اور نہ ہم ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے لیے آمادہ ہیں۔ ممالک اسلامیہ نے جس دن سے اسلام کو قبول کیا ہے اُسی دن سے وہاں اسلامی قوانین کا نفاذ عمل میں آ گیا تھا۔ یہ قوانین صدیوں تک جاری اور نافذ رہے۔ حتیٰ کہ یورپ کے استعمار پسندوں نے ان ممالک کو اپنے تسلط میں لے لیا اور وہاں یا تو خود مغربی قوانین کو رائج کر دیا یا مقامی حکومتوں کو ترغیب دے کر اس پر آمادہ کیا کہ وہ اپنے مربیوں کے زیر سایہ جدید طرز کے قوانین اپنے ہاں وضع کریں۔ اس

کا ہیولیٰ کے لیے بار بار جو دلیل پیش کی جاتی تھی وہ یہ تھی کہ ان قوانین سے مقصود یہ ہے کہ مغرب کی ترقی یافتہ تہذیب و معاشرت کو اخذ کیا جائے۔ گویا کہ مغرب کی تمدن کے معراج کمال تک رسائی ہو چکی ہے اور مسلمانوں کے پیچھے رہ جانے کی تنہا وجہ قوانینِ شریعت کی پابندی ہے! یہ دلیل اپنے بودے پن کے باوجود بعض دماغوں میں جاگزیں ہو گئی، حتیٰ کہ اسے عام طور پر صحیح سمجھا جانے لگا، اسے کتابوں میں لکھا جانے لگا اور مدارس میں اسے پڑھایا جانے لگا۔

دلیلِ باطل اس دلیل کے علمبردار اگر کچھ بھی غور و فکر سے کام لیتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ ان کی دلیل بالکل لغو اور باطل ہے۔ اگر وہ تھوڑی دیر کے لیے سوچتے تو انہیں اندازہ ہو جاتا کہ جن قوانین پر وہ لٹو ہوئے جا رہے ہیں وہ تمام تر پرانے لاطینی قوانین سے ماخوذ ہیں جب مسلمانوں کا تصادم رومی سلطنت سے ہوا تھا اس وقت یہ قوانین رومیوں کے کچھ بھی کام نہ آسکے تھے اور مسلمانوں نے اس عظیم الشان مملکت کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ اسی طرح صلیبی لڑائیوں میں پورے یورپ کو مسلمانوں کے مقابلے میں شکستِ فاش ہوئی تھی، حالانکہ اس سارے برِ اعظم میں اُس وقت رومن لا ہی کی عملداری تھی۔ پھر تاریخ کے مطالعے سے اس حقیقت کا معلوم کر لینا بھی کچھ مشکل نہیں ہے کہ عرب میں امتِ مسلمہ کا آغاز ایک قلیل اور ضعیف جماعت کی حیثیت میں ہوا تھا اور ہر دم یہی کھٹکا لگا رہتا تھا کہ ان کے وجود کو ہی ملیا میٹ نہ کر دیا جائے۔ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بیس سال بعد جو ریاست انہی قوانینِ شریعہ کے بل پر قائم ہوئی تھی اُس نے فارس کی سلطنت کو تو بالکل صفحۂ ہستی سے ہی مٹا دیا اور رومی بادشاہت کے تسلط سے شام، مصر اور شمالی افریقہ کو آزاد کرا لیا۔ اس کے بعد ایک ہزار سے زائد برس تک مسلمانوں کو اقوامِ عالم کی امامت اور قیادت کا منصب حاصل رہا۔ انہوں نے صلیبیوں کا قلع قمع کیا، تاتاریوں کو مغلوب کیا اور مشرقی، جنوبی اور مغربی یورپ میں جا کر اسلام کا جھنڈا گاڑا اور وہاں بھی صدیوں تک ریاست اور حکومت کا کاروبار اسلامی قوانین کے تحت سرانجام پاتا رہا۔

کاش کہ یہ غافل اور سادہ لوح لوگ مصر کے ماضی قریب پر ہی نگاہ ڈال لیتے۔ محمد علی پاشا کے عہد میں مصر یورپ کے بہت سے ممالک سے زیادہ طاقتور تھا۔ مصر نے اُس وقت فرانسیسیوں کو مار کر بھگا دیا تھا اور انگلستان کا مقابلہ سمندر میں جا کر کیا تھا۔ مصری افواج نے یونانیوں کے گھر میں جا کر ان کے دانت کھٹے کر دیئے

تھے حالانکہ اس وقت یورپ کی متعدد حکومتیں یونان کی مدد کر رہی تھیں۔ اُس وقت اگر دول یورپ سازش کرکے ہمارے خلاف متحد نہ ہو جاتیں تو حجاز، سوڈان، شام، ترکی اور مصر آج ایک ہی جھنڈے کے نیچے جمع ہوتے۔ اس سارے دور میں ہمارے ہاں یورپ کے قوانین نہیں بلکہ شرعی قوانین رائج تھے۔

ان سارے واقعات کے باوجود اگر کوئی کہنے والا یہ کہتا ہے کہ مسلمانوں کے زوال کا باعث شرعی قوانین ہیں اور یورپ والوں کی ترقی کا سبب مغربی قوانین ہیں تو اس پر سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ بعض اوقات غفلت یا غرض پرستی آدمی کو بالکل اندھا بہرا کر دیتی ہے۔ اس طرح کے نادان لوگوں کو چاہیے کہ وہ مسلمانوں اور مغربی قوموں کی تاریخ کا کچھ مطالعہ کریں اور یہ جاننے کی کوشش کریں کہ کامیابی اور سرخروئی کی اصلی علت کیا ہے۔

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ	کیا یہ لوگ زمین میں نہیں پھرے تاکہ ان کے دل
قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ	ہوتے جن سے یہ سمجھتے یا کان ہوتے جن سے سنتے۔
بِهَا فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى	یقیناً آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل اندھے
الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ (الحج: ۴۶)	ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔

مسلمانوں کو زوال اتباعِ شریعت سے نہیں بلکہ ترکِ شریعت سے ہوا

مسلمانوں کے زوال و انحطاط کا باعث شریعت ہرگز نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ قوانینِ شریعت روئے زمین کے تمام قوانین سے افضل اور اشرف ہیں۔ قانون کا کوئی بہتر سے بہتر نظریہ آج تک منکشف نہیں ہوا جو شریعت میں اپنی مکمل اور عمدہ ترین شکل میں موجود نہ ہو۔ علمائے قانون نے قانون کا کوئی جدید سے جدید تر تصور اور تخیل ایسا نہیں پیش کیا جو شریعت میں اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ موجود نہ ہو۔ مسلمان آج اس لیے ذلیل و خوار نہیں ہیں کہ وہ شریعت کے قوانین پر عامل ہیں بلکہ ان کی ذلت کی اصل وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اس پر عمل کرنا چھوڑ دیا ہے۔ آج تمام دیارِ اسلامیہ کے مسلمان محض زبانی دعوے کرنے والے نام کے مسلمان ہیں۔ وہ اپنے خیالات اور اعمال کے لحاظ سے مسلمان نہیں ہیں الا ما شاءاللہ وقلیل ماھم۔

اگر قوانین میں جدت ہی قوموں کی ترقی کا باعث ہوتی تو بلجیم انگلستان سے زیادہ طاقتور اور ترقی یافتہ

ہوتا، کیونکہ بلجیم کے قوانین جدید ترین ہیں اور انگلستان کے متعدد قوانین قدیم ترین ہیں اور ان میں بہت سے قوانین اُس وقت سے چلے آرہے ہیں جبکہ انگلستان بالکل مجہول الحال تھا اور دنیا میں اُسے کوئی قابل ذکر مقام حاصل نہ تھا۔ پھر جو لوگ شریعت اسلامیہ کے قوانین کو قدیم اور بوسیدہ سمجھتے ہیں، ان کا یہ خیال ہی غلط فہمی اور جہالت پر مبنی ہے۔ یورپ کے بیشتر ضابطہ ہائے قوانین کے بالمقابل شریعت کے قوانین قدیم نہیں بلکہ جدید ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یورپ کے قوانین کی بنا رومن لا پر رکھی گئی ہے۔ ان کی اٹھان رومن قانون کے نصوص و قواعد کے حدود اربعہ میں ہی ہوئی ہے۔ ان کے اندر سارے اساسی اور بنیادی تصورات و نظریات وہی کام کر رہے ہیں جو رومن مقننین نے پیش کیے تھے۔ یورپ کے قوانین کی تخریج اور استنباط کا سارا کام انہی اصول و حدود کے دائرے میں سرانجام دیا جاتا ہے، الّا یہ کہ کسی شدید ضرورت کی بنا پر اس راستے سے ہٹنا پڑے۔ اس لحاظ سے یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ اپنے ماخذ اور مبدأ کے اعتبار سے قوانینِ اسلامیہ یورپین قوانین کی بہ نسبت جدید تر ہیں نہ کہ قدیم تر، کیونکہ اسلام کے قوانین کی اصل قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے اور قرآن و سنت کا نزول رومن لا کی تشکیل کے بعد ہوا ہے۔

مسلمانوں کو یہ حقیقت اپنے ذہن سے کبھی محو نہیں کرنی چاہیے کہ شریعت ہی انہیں عدم سے وجود میں لانے، انہیں خیر الامت بنانے اور دنیا بھر میں انہیں سرفراز کرنے کا موجب ہوئی ہے۔ شریعت نے ہی ان کی تعلیم و تربیت کی، انہیں علوم و آداب سکھائے اور انہیں عزت و شرافت کے جوہر سے شناسا کیا۔ شریعت ہی نے ان کے اندر قوت اور عزیمت پیدا کی، ان کے اندر ایسے ایسے جہانبان اور کشورکشا پیدا کیے جنہوں نے چاردانگ عالم میں عظیم الشان مملکتوں کی بنیاد رکھی، ایسے ایسے علماء و ادباء پیدا کیے جنہوں نے علم و ادب کی بے نظیر خدمات سرانجام دیں۔ مسلمانوں کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام کا قانون سب سے پہلا قانون ہے جس نے انسانوں کے مابین مساواتِ تامہ اور عدالتِ مطلقہ کے تصور کو عملی جامہ پہنایا اور ان پر تعاون علی البر و التقوی، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو واجب ٹھہرایا۔ ان مقاصد کے حصول کے لحاظ سے قوانینِ موضوعہ شرعی قوانین کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ مسلمانوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ مسلمانوں نے جب تک شریعت کا دامن تھامے رکھا دنیا میں وہ کامران اور سرخرو رہے اور جب انہوں نے اس کا دامن چھوڑ دیا اُس وقت وہ

اسلام سے قبل کی جاہلیت اور تاریکی کی طرف لوٹ گئے۔ ضعف، ذلت اور مسکنت نے انہیں آدبوچا اور وہ اس قابل بھی نہ رہے کہ ظالم کی دراز دستیوں کے مقابلے میں اپنی مدافعت کر سکیں۔

قرونِ اولیٰ کے مسلمان ایمان لائے اور حق یہ ہے کہ انہوں نے ایمان لانے کا حق ادا کر دیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انہیں زمین میں تمکن عطا کیا۔ جس قدیر و عزیز نے اُن مسلمانوں کو قلت اور ضعف کے باوجود طاقت بخشی تھی وہ یقیناً اس بات کی قدرت رکھتا ہے کہ ہمیں بھی طاقت اور قوت بخشے بشرطیکہ ہم بھی ایمان کا حق ادا کریں۔ یہ اللہ کا اپنے بندوں سے وعدہ ہے اور اللہ سے بڑھ کر اپنا وعدہ وفا کرنے والا کون ہو سکتا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (النور: ۵۵)

وعدہ کیا ہے اللہ نے اُن لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں تم میں سے اور اعمال کیے ہیں انہوں نے اچھے کہ خلیفہ بنائے گا انہیں زمین میں جیسے کہ خلیفہ بنایا اُن لوگوں کو جو اُن سے پہلے تھے۔

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ۔ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔ (المائدہ: ۱۵)

آگئی ہے تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی اور کتاب مبین۔ اس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ سلامتی کے راستے دکھاتا ہے اپنی رضا کی پیروی کرنے والوں کو اور نکالتا ہے انہیں تاریکیوں سے روشنی کی طرف اپنے اذن سے اور انہیں سیدھے راستے کی ہدایت دیتا ہے۔

قوانینِ وضعیہ کا ابطال ہر ایسا قانون جو قرآن و سنت، اُس کے اصول و مبادی اور اُس کی روح کے خلاف ہو وہ مطلقاً باطل اور کالعدم ہے۔ کسی مسلمان کے لیے اُس کی اطاعت جائز نہیں بلکہ اس کے خلاف محاربہ لازم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شریعت کے اوامر و نواہی کا مقرر کیا جانا کوئی فعل عبث نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب اور اپنے رسول کو اس لیے بھیجا ہے کہ لوگ ان کی اطاعت کریں۔ جو رسول کی لائی ہوئی شریعت کے مطابق عمل کرتا ہے اس کا فعل صحیح اور جائز ہے کیونکہ وہ شارع کے حکم کے موافق ہے اور جو شریعت کی

مخالفت کرتا ہے اُس کا فعل باطل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۔ (النساء: ۶۴)	ہم نے نہیں بھیجا کوئی رسول مگر اس لیے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے اذن سے۔
وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (الحشر: ۷)	جو کچھ تمہیں دے رسول اُسے لے لو اور جس سے تم کو منع کرے رُک جاؤ۔

بطلان کے دلائل اسلام میں قانون سازی کے مآخذ کتاب، سنت اور اجماع ہیں اور ان تینوں کے اندر اس بات کے حق میں دلائل موجود ہیں کہ شریعت سے آزاد ہو کر جو قانون سازی بھی کی جائے وہ باطل اور بے اصل ہے۔ قرآن اور سنت کے نصوص اس بارے میں بالکل قطعی اور صریح ہیں اور ان نصوص کی موجودگی میں اجماع کا انعقاد ایک ناگزیر امر تھا۔ ذیل میں ہم غیر شرعی قوانین کے ابطال کے حق میں چند دلائل پیش کرتے ہیں۔

۱۔ اللہ تعالیٰ نے اطاعت و اتباع کی صرف دو قسمیں قرآن میں بیان فرمائی ہیں۔ یا تو اتباع اللہ اور اس رسول کے فرمان کا ہے اور یا پھر اتباعِ ہویٰ اور خواہشاتِ نفس کی اطاعت اور پیروی ہے۔ ان دونوں کے مابین کوئی تیسری شکل نہیں ہے اور ان دونوں میں سے ایک خالص ہدایت ہے اور دوسری خالص ضلالت۔

فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ۭ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ۔ (القصص: ۵۰)	اگر وہ تمہاری بات نہ مانیں تو جان لو کہ وہ صرف اپنی خواہشات کی پیروی کر رہے ہیں اور کون بڑھ کر گمراہ ہے اُس سے جو اپنی خواہش کی پیروی کرے بغیر اللہ کی ہدایت کے۔
يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔ (ص: ۲۶)	اے داؤد ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا ہے پس حکومت کرو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ اور مت پیروی کرو خواہش کی ورنہ وہ تجھے سیدھے راستے سے بھٹکا دے گی۔
ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰي شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ	پھر ہم نے تم (محمدؐ) کو حکم دینے کے ایک طریقے پر قائم کیا

فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (الجاثیہ: ۱۸)

پس اس کا اتباع کرو اور مت پیروی کرو ان کی خواہشات کی جو نہیں جانتے۔

اِتَّبِعُوْا مَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ۔ (الاعراف: ۳)

پیروی کرو اُس چیز کی جو اتاری گئی ہے تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے اور مت پیروی کرو اس کے علاوہ اولیا کی کم ہی تم نصیحت حاصل کرتے ہو۔

ان نصوصِ قرآنیہ نے اتباعِ خلافِ شریعت کو قطعی طور پر حرام قرار دے دیا ہے، اور شریعت کے سوا کسی دوسری شے پر عمل کرنے کو کلیۃً ممنوع قرار دے دیا ہے۔ جو آدمی ایسا کرتا ہے اُس پر اتباعِ ہوئی اور ضلالت کا حکم لگا دیا گیا ہے۔ ایسا شخص گمراہ ہے، ظالم ہے، اللہ کے اتارے ہوئے احکام کا باغی ہے اور اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا ولی بنانے والا ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے تحاکم الی غیر اللہ کو حرام قرار دیا ہے اور مومن کے لیے اس بات کو جائز نہیں ٹھہرایا کہ وہ اللہ کے حکم کے علاوہ کسی دوسرے کے حکم پر راضی اور مطمئن ہو۔ اگر وہ ایسا کرے تو اسے دور کی گمراہی اور شیطان کی پیروی قرار دیا گیا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْۤا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْۤا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًا بَعِيْدًا۔ (النساء: ۶۰)

کیا تو نے نہیں دیکھا ان لوگوں کی طرف جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ایمان لائے ہیں اُس چیز پر جو اتاری گئی ہے تیری طرف اور جو اتاری گئی ہے تجھ سے پہلے وہ ارادہ رکھتے ہیں کہ اپنے فیصلے طاغوت سے کرائیں حالانکہ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس کا انکار کریں اور شیطان چاہتا ہے کہ انہیں گمراہ کر کے دور بھٹکا دے۔

پس جو کوئی اللہ کی نازل کی ہوئی اور اُس کے رسول کی لائی ہوئی تعلیمات کے مطابق اپنے معاملات کے فیصلے نہیں کراتا، اُس نے یقیناً طاغوت کو اپنے لیے حَکَم بنا لیا ہے۔ اللہ کی مخلوقات میں سے جو کوئی بندگی کے مقام سے بڑھ کر معبود، متبوع اور مطاع کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے وہ طاغوت ہے چنانچہ

اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ جس کسی کو بھی اپنے تنازعات میں ثالث بنایا جاتا ہے، اس کی عبادت کی جاتی ہے یا اس کی غیر مشروط اطاعت کی جاتی ہے وہ طاغوت کی تعریف میں آجاتا ہے۔ جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہے اُس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ غیر اللہ پر بھی ایمان لائے اور جس نے اللہ سے فیصلہ طلب کرنے کا عہد کر لیا ہے اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ غیر اللہ سے بھی جا کر فیصلہ طلب کرے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے کسی مومن مرد یا مومن عورت کے لیے یہ جائز نہیں رکھا ہے کہ وہ کسی ایسے معاملے میں اپنے لیے آزادی انتخاب کو استعمال کرے جس معاملے میں اللہ اور اُس کے رسول نے کوئی فیصلہ صادر فرما دیا ہو۔ جو شخص ایسا کرتا ہے اُسے اپنے ایمان کی خیر منانی چاہیے۔ قرآن کی رُو سے وہ کافر، ظالم اور فاسق ہے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ أَمْرًا أَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ (الاحزاب: ۳۶)

کسی مومن یا مومنہ کا یہ کام نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ کر دیں تو ان کے لیے کوئی اختیار و انتخاب کا موقع رہ جائے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق ہر معاملے میں فیصلہ کریں۔

وَأَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ (المائدہ ۴۹)

اور یہ کہ فیصلہ کرو ان کے درمیان اُس چیز کے مطابق جو اللہ نے نازل کی ہے۔

إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللّٰهُ (النساء: ۱۰۵)

ہم نے نازل کی ہے تمہاری طرف کتاب حق کے ساتھ تاکہ تم فیصلہ کرو لوگوں کے درمیان اُس چیز کے مطابق جو اللہ نے تم کو سجھائی ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ ... هُمُ الظَّالِمُوْنَ ... هُمُ الْفَاسِقُوْنَ۔ (المائدہ: ۴۴-۴۷)

جو کوئی اللہ کے نازل کردہ کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہی کافر ہیں ..... ظالم ہیں ... فاسق ہیں۔

مسلمانوں میں یہ بات متفق علیہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان اللہ کے نازل کردہ احکام کے علاوہ کسی دوسرے طریق پر اپنے معاملات کے فیصلے کراتا ہے اُس پر اللہ تعالیٰ کی ان تینوں آیات میں سے ایک نہ ایک آیت

ضرور صادق آتی ہے۔ مثلاً چوری یا قذف یا زنا کے معاملے میں اگر کوئی شخص اپنے مقدمے کا فیصلہ غیر اسلامی قوانین کے مطابق اس لیے کرانا چاہتا ہے کہ وہ غیر اسلامی قوانین کو اسلامی قوانین سے افضل او ربہتر سمجھتا ہے تو وہ قطعی کافر ہے۔ اپنے دل اور اپنی زبان سے اگر ایک شخص اسلامی قوانین تعزیرات کی برتری کو تسلیم کرتا ہے لیکن ضعف ایمانی یا کسی دوسری مجبوری کی بنا پر وہ غیر اسلامی قوانین سے مدد لیتا ہے تب بھی فاسقین کے زمرے میں شامل ہونے سے وہ اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا۔ اور اگر وہ کسی کی حق تلفی یا کسی سے بے انصافی بھی کرتا ہے تو وہ ظلم کا ارتکاب بھی کرتا ہے۔

۵۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی قسم کھا کر اس حقیقت کو بیان فرمایا ہے کہ ایک شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے ہر چھوٹے بڑے معاملے میں رسول کو اپنا ثالث اور پنچ نہ تسلیم کرے۔ پھر ایمان کے لیے اس طرح کی تحکیم کا محض ظاہری اور مجرد صورت میں مان لینا کافی نہیں ہے بلکہ ایمان کے وجود اور ثبات کے لیے یہ بھی لازمی ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں سپر ڈال دینے کا فعل پوری خوشدلی اور آمادگیٔ نفس کے ساتھ سرانجام پائے۔ اور ظاہر ہے کہ رسولؐ کا فیصلہ یا تو کتاب الٰہی کے نصوص پر مبنی ہوگا اور یا اللہ کی عطا کردہ اُس حکمت و بصیرت پر مبنی ہوگا جس کا عملی مظاہرہ "سنت" کی شکل میں وجود پذیر ہوا ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (النساء: ۶۵)	نہیں، تیرے رب کی قسم نہیں ایمان لا سکتے جب تک کہ وہ تجھے حکم نہ بنا لیں اپنے تنازعہ فیہ معاملات میں، پھر نہ پائیں اپنے دل میں تنگی آپ کے فیصلے کی وجہ سے اور سر تسلیم خم کر دیں۔

۶۔ جو شے اسلام میں حرام ہے وہ دنیوی قوانین و احکام کے حلال کر دینے کے باوجود حرام ہی رہتی ہے۔ اسلام میں حق قانون سازی مقید اور مشروط ہے اور اس حق کو ایک مسلمان بھی اسلام کی عائد کردہ حدود کے اندر ہی استعمال کر سکتا ہے۔ اگر کوئی ہیئت حاکمہ ان حدود سے تجاوز کرے اور اس طرح کے قوانین کو بنانا اور نافذ کرنا شروع کر دے جن کی اسلام میں گنجائش نہیں ہے، تو ایک مسلمان کے لیے ان قوانین کا اتباع و نفاذ ازروئے شرع واجب نہیں ہے بلکہ اُس کے لیے لازم ہے کہ وہ ان کے بدلنے کے لیے کشمکش اور جدوجہد کرے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا۔ (النساء: ۵۹)	اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور رسول کی اور اپنے میں سے اولی الامر کی۔ اگر تم میں تنازع ہو جائے کسی شے میں تو لوٹا دو اسے اللہ اور رسول کی طرف اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور یوم آخرت پر۔ یہ بہتر اور عمدہ ہے انجام کے اعتبار سے۔

اللہ جل شانہ نے اپنی اطاعت اور اپنے رسول کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ اطاعت کے فعل کی تکرار سے پتہ چلتا ہے کہ اطاعت رسول کی بھی ایک مستقل حیثیت ہے۔ رسول جس بات کا بھی حکم دے خواہ وہ قرآن میں مذکور ہو یا نہ ہو، اُس کی اطاعت واجب ہے۔ کیونکہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مجھے قرآن اور اُس کے ساتھ اُسی جیسی ایک چیز عطا کی گئی ہے (اوتیت الکتب ومثلہ معہ)۔ اولی الامر کے ساتھ اطاعت کے لفظ کو دُہرایا نہیں گیا۔ کیونکہ یہ اطاعت مستقل بالذات نہیں ہے بلکہ یہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے تحت آتی ہے۔ اسی طرح سے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت پہلے آیا ہے اور اولی الامر کا ذکر بعد میں۔ گویا کہ سبقت اور تقدم اللہ اور رسول کی اطاعت کو حاصل ہے۔ جب اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کا حق ادا ہو چکتا ہے اور جب ان کی مخالفت کا امکان باقی نہیں رہتا اُس وقت اولی الامر کی اطاعت لازم آتی ہے۔ پس جو حکمران اللہ اور اُس کے رسول کے فرمان کے مطابق حکم دیتا ہے اس کی اطاعت واجب ہے اور جو اس کے خلاف حکم دے اُس کے لیے سمع وطاعت کا حق ہرگز ثابت نہیں ہے۔ (باقی)

پاکستان اور امریکی دستور

ایک علمی مطالعہ و تجزیہ

نعیم صدیقی

ہمارے ہاں گذشتہ آٹھ دس مہینے کے بحرانی دور میں امریکی دستور کا تذکرہ بار بار عجیب انداز سے چھڑا ہے۔ اچانک ایوانِ اقتدار سے یہ آواز عوام کو سنائی دی کہ برطانوی انداز کے دستوری ڈھانچے کو چھوڑ کر ہم امریکی طرز کا ڈھانچہ اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ تاریخ اور سیاست اور دستوریات کے طالب علموں کے دل میں یہ بولی سنتے ہی قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوا کہ آخر ملک کے دستوری رجحانات میں کونسا تغیر و تبدل ایسا رونما ہوگیا ہے کہ جس کا ردِ عمل یوں ظاہر ہو رہا ہے۔ کیا علمائے دین و سیاست کہیں سر جوڑ کر بیٹھے اور انہوں نے غور و فکر کے بعد یہ رہنمائی دی ہے؟ کیا عام لوگوں کی طرف سے کوئی ایجی ٹیشن ہوا ہے؟ کیا سیاسی پارٹیوں نے اس طرح کا کوئی مطالبہ کیا ہے؟ کیا اخباروں کے کالموں میں اس موضوع پر کوئی بحث چھڑ کر کسی ایسے نتیجے پر پہنچ گئی ہے؟ آخر وہ محرک کیا ہے جو اس بولی کے پیچھے کام کر رہا ہے؟ پھر سوچنے والے یہ بھی سوچتے ہیں کہ کیا ہماری ملی آئیڈیالوجی یا ہماری پچھلی سیاسی تاریخ میں کوئی ایسا تقاضا دبا پڑا تھا جو ہمیں برطانوی دستوری ڈھانچے سے ہٹا کر امریکی ڈھانچے کی طرف لے جانے کے لیے زور کر رہا ہو اور اب یکایک اپنے لیے سازگار فضا پا کر پھوٹ آیا ہو اور دیکھتے دیکھتے ایک تناور درخت کی صورت اختیار کر گیا ہو۔ پھر ایک معمّا یہ بھی حل طلب قرار پاتا ہے کہ امریکی دستور کم سے کم مغربی تصورِ جمہوریت کے لحاظ سے دنیا بھر میں معیاری حیثیت رکھتا ہے اور اس کی طرف اگر نگاہِ تقلید اٹھ سکتی ہے تو صرف ایسے لوگوں کی اٹھ سکتی ہے جو مغربی طرز کی معیاری جمہوریت کی نیو ڈالنا چاہتے ہوں اور حکمرانی کے اختیار کا اصل سرچشمہ عوام کو قرار دے کر اپنے مقابلے میں ان کو پورے پورے جمہوری حقوق سے آراستہ کرنا چاہتے ہوں اور اپنے مستبدانہ اختیارات

سے ملکی فلاح و بہبود کے لیے دست بردار ہونا چاہتے ہوں۔ پھر آخر کیا وجہ ہے کہ پاکستان کی سرزمینِ عجائبات میں امریکی دستوری ڈھانچے کی طرف نگاہ اُٹھی بھی تو ایسے لوگوں کی اُٹھی جو قوم کے مقابلے میں نہ صرف یہ کہ غیر محدود اندھے اختیارات سے مسلح ہیں اور ان میں نت نئے اضافے کرنے کے درپے ہیں، بلکہ اپنی ٹیم کے حلقے میں اختیارات کی تقسیم ہی کے لیے ایک غیر مختتم سازشی جہاد برپا کیے ہوئے ہیں اور جن کا حال یہ ہے کہ اپنی اسی اقتدار طلبی کی کشمکش پر انہوں نے ملک کی رہی سہی برائے نام جمہوریت کو بھی پہلا موقع پاتے ہی بھینٹ چڑھا کر آمریت کی ایک خوفناک فضا پیدا کر دی۔ عین اسی خود پیدا کردہ فضا میں صدا بلند کی جاتی ہے کہ ہم برطانوی طرز کے دستوری ڈھانچے کو چھوڑ کر امریکی ڈھانچہ اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ اس میں کوئی راز ہے اور بڑا اہم راز ہے۔ آیئے اسے کھود نکالیں۔

یاد کیجیے اس واقعہ کو کہ ہمارے ہاں جو سیاسی بحران ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو نمودار ہوا تھا اس کے پس منظر میں یہ واقعات کارفرما تھے:

پروڈا نامی قانون، جو گورنر جنرل کو وزارت کے خلاف ایک خصوصی اختیار کے مضبوط لٹھ سے مسلح کیے ہوئے تھا، مرکزی پارلیمنٹ میں اس کی منسوخی کا بل پاس ہوتا ہے لیکن سابق میں جو افراد اس قانون کے تحت کسی تادیبی کارروائی کی زد میں آچکے تھے ان کو یہ بل ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔ اس تبدیلی سے گورنر جنرل اور وزارت کا سابق توازنِ قوت بالکل متزلزل ہو گیا۔ یہ چیز گورنر جنرل کی خوشنودی کے بالکل خلاف تھی۔ چنانچہ اور تو کچھ نہ ہو سکا، گورنر جنرل نے معافی کے خاص اختیارات سے کام لے کر میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ (پنجاب) اور محمد ایوب کھوڑو (سندھ) کو پروڈا کی تادیبی کارروائی کی زد سے باہر نکال لیا۔

وزارت نے مزید ممکن اقدامات کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے کو نئے خطرے میں محسوس کیا تو ایک قدم اور آگے بڑھا دیا۔ اس نے دستور میں ترمیم کر کے گورنر جنرل کے تمام خصوصی اختیارات سلب کر لیے اور اسے محض دستوری سربراہ کی حیثیت دے دی۔ اس اقدام سے اقتدار کا توازن بالکل بنیادی طور پر بدل گیا۔

یہ دو حادثے اگر رونما نہ ہوتے تو شاید سرے سے وہ بحرانی دور ہی شروع نہ ہوتا جس سے گزرتے ہوئے ہم نے بہت کچھ کھویا ہے۔ اس کے چند ہی روز بعد دستور یہ توڑنے کا اعلان ہو جاتا ہے اور جبر

یہ آواز اٹھتی ہے کہ پاکستان کا آئندہ دستور امریکی ڈھانچے پر بنے گا اور اس کی تسوید ہو رہی ہے۔ درحقیقت امریکی ڈھانچے میں جس چیز کو دیکھ کر بعض حضرات کی رال ٹپکی وہ صدر کے اختیارات اور اس کی مضبوط دستوری حیثیت ہے۔ اس دستور میں ہمارے بزرگوں کو سرے سے اور کوئی جاذب توجہ چیز ملی ہی نہیں۔ اس میں واحد قابل قدر جوہر انہیں صرف یہ دکھائی دیا ہے کہ صدارت کا تخت جب ہم بچھا کر بیٹھیں گے تو ہمارے ہاتھوں میں بڑی بھاری طاقت ہوگی اور ہمارے قبضے میں بڑے وسیع اختیارات ہونگے۔

برطانوی نظام دستور میں سربراہ مملکت بے بس ہوتا ہے لیکن امریکی نظام میں طاقت کا ایک بڑا حصہ مقننہ کے مقابلے میں اس کو دیا جاتا ہے۔ ہمارے بزرگ امریکی صدر کی سی طاقت تو حاصل کر لینا چاہتے ہیں مگر اس کے جواب میں عوام کو وہ کچھ دینے پر تیار نہیں ہیں جو امریکی دستور اپنے عوام کو دیتا ہے۔ عوام کے حقوق کا سوال آئے تو یہ فوراً کہیں گے کہ ہمارے عوام جاہل، بدھو، نالائق اور نااہل ہیں۔ ان کو امریکی اور برطانوی طرز کی جمہوریت نہیں دی جا سکتی۔ ان کو صرف کنٹرول کی ہوئی اور راشن کی ہوئی جمہوریت ملے گی۔

اسلامی نقطۂ نظر سے ہمارے سامنے امر واقعہ یہ ہے کہ ایک مسلمان قوم اپنے نظام فکر و تہذیب کے مطابق خود مختارانہ زندگی بسر کرنے کے لیے ایک لمبی جدوجہد کرتی ہوئی پاکستان کو حاصل کرتی ہے اور اب وہ اس امر کے لیے بے چین ہے کہ اس کی دیرینہ ملی تمناؤں کے مطابق ایک اسلامی ریاست تشکیل پذیر ہو۔ وہ اپنی ریاست کو اپنی مخصوص آئیڈیالوجی پر استوار کرنا چاہتی ہے۔ دستور کے اصولیات اور اس کے ڈھانچے کے بارے میں جب بھی سوچا جائیگا تو سب سے پہلے یہی آئیڈیالوجی زیر غور آئیگی کہ اس کے تقاضے کیا ہیں۔ بغیر تفصیل میں جانے ہم یہ رائے رکھتے ہیں کہ ہماری آئیڈیالوجی جہاں ہمیں دستوری اصولیات دیتی ہے وہاں وہ ان اصولوں کے اندر سے اپنا ایک الگ اور مستقل نوعیت کا دستوری ڈھانچہ بھی برآمد کر سکتی ہے۔ اس آئیڈیالوجی کے تحت ایک معیاری اسلامی دستور کے بننے اور چلنے کا موقع جب پیدا ہوگا تو دنیا کے سامنے ایک نیا دستوری ڈھانچہ اسی طرح رونما ہو جائیگا جس طرح امریکہ اور روس نے اپنے اپنے ملی اور تہذیبی حالات کے مطابق آزادانہ ذہن سے کام لے کر نئے ڈھانچے پیدا کر دکھائے ہیں۔ لیکن دور حاضر کی ضروریات کے لحاظ سے نمونے کے معیاری اسلامی دستور تک

پہنچنے سے پہلے ہمیں ایک ایسا عبوری مرحلہ طے کرنا ہے جس میں نظریۂ اسلامی سے ماخوذ دستوری اصولوں کو کسی ایسے ڈھانچے کے ساتھ نافذ کر دیا جائے جس کو قبول کرنے اور چلانے پر آسانی سے ذہنی اشتراک پیدا کیا جاسکے۔ اس عبوری مرحلے کی ضرورت کے لحاظ سے اصولاً اسلام کی آئیڈیالوجی اور اس کے دستوری اصول اور تقاضے برطانوی یا امریکی کسی بھی ڈھانچے کے اندر یکساں کارفرما ہو سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اسلامی نقطۂ نظر سے ہم نہ ان ڈھانچوں میں کسی ایک کے لیے کوئی تعصب آمیز حمایت رکھتے ہیں، نہ مخالفت! البتہ یہ ضرور کہتے ہیں کہ دونوں میں سے جس کو بھی لیا جائے اسے اس کے تمام ضروری عناصر ترکیبی کے ساتھ لیا جائے اور ایسا نہ ہو کہ دونوں کی خوبیوں کو ضائع کرکے دونوں کی برائیوں کو جمع کر لیا جائے۔ نیز یہ بھی کہتے ہیں کہ برطانوی ڈھانچے پر کام کرنے کے مقابلے میں امریکی ڈھانچے پر کام کرنے کی صورت میں جو مشکلات سامنے آتی ہیں ان کو پہلے سوچ لیا جائے۔ اور یہ مسئلہ چند شخصیتوں کے سوچنے کا نہیں، پوری قوم کے غور و فکر کا محتاج ہے۔ ہم ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ ایک بار امریکی دستور کی ماہیت کو تعلیم یافتہ عوام بالخصوص دستور ساز حضرات کے سامنے واضح کر دیں۔

امریکی دستور کا ذہنی اور تاریخی پس منظر | کسی قوم کا دستور خارج سے درآمد کرکے اس کے اوپر اوڑھا دینے کی چیز نہیں ہوتا کہ جب جہاں سے چاہا ایک دستور یا اس کا کوئی جزو لے لیا اور جب پھر چاہا اسے پرے پھینک کر کوئی دوسرا کسی اور بازار سے منگا لیا۔ دستور ایک قوم کے نفسیاتی، اعتقادی، معاشی، معاشرتی اور تاریخی عوامل کی ضرورتوں اور تقاضوں سے ترکیب پاتا ہے۔ اس کی بڑی گہری جڑیں ہوتی ہیں۔ اس کے بڑے عوائق و علائق ہوتے ہیں۔ اس کے پس منظر میں بڑی موثر طاقتیں کام کر رہی ہوتی ہیں۔ اسی اصول پر اگر آپ امریکی دستور کا مطالعہ کرنا چاہیں تو آپ کو اس کے تاریخی اور سیاسی و تہذیبی پس منظر کا جائزہ لینا ہوگا۔

"تاریخ و سیاست کا متوسط مطالعہ رکھنے والا بھی یہ جانتا ہے کہ انقلاب امریکہ درحقیقت انقلاب انگلستان کا پہلوٹھا بچہ تھا۔ یہ درحقیقت ان برطانویوں کے اخلاف کا کارنامہ ہے جنہوں نے چارلس اول کے "خدائی حقوق" کے خلاف معرکہ لڑ کر نمائندہ پارلیمنٹ کے ذریعے حکومت خود اختیاری کی سمت میں ایک تاریخ افروز قدم اٹھایا۔ یہ اٹھارہویں صدی جس کے اختتام پر امریکی انقلاب ظہور میں آیا ایک ایسے دور پر مشتمل تھی جس میں یورپ

کی سرزمین پر سابق مذہبی بنیادوں سے ہٹ کر قومی اور نسلی اساس پر حکومتوں اور معاشروں کی اٹھان ہو رہی تھی۔ سوداگروں کے سرمایوں اور تجارتی کمپنیوں کے بحری بیڑوں کی طاقت حکمرانوں کی پشت پر تھی اور اس طاقت کے بل پر وہ ایشیا، افریقہ اور امریکہ میں نوآبادیاں پیدا کرنے کی کشمکش میں لگ گئے۔

ہسپانیہ اور پرتگال ایک صدی پہلے سے بحر ہند اور بحر الکاہل کو چھان رہے تھے کہ یکایک ہالینڈ اور انگلستان بیچ میں آکودے۔ عجیب اتفاق کہ بعد میں آنے والے پہلوں کے مقابلے میں فائدہ میں رہے اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ہسپانویوں اور پرتگالیوں نے بڑی حد تک ابتدائی مشکل کام سرانجام دے لیے تھے اور ہالینڈ اور انگلستان کو کامیابی کے راستے بنے بنائے مل گئے۔ دوسری وجہ یہ ہوئی کہ اول الذکر طاقتیں مقامی آبادیوں کے مقابلے میں انتہائی ظالمانہ رویہ اپنانے کی وجہ سے ان کی نگاہوں میں سخت مردود ہو چکی تھیں بعد میں جب مؤخر الذکر دو طاقتیں ان کی حریف بن کر میدان میں اتریں تو مقامی آبادیوں نے ان کو اپنا نجات دہندہ سمجھا اور انہوں نے بھی تجربوں کی روشنی میں اپنے خطوط روابط زیادہ بہتر موقع پر کھینچے۔ یہ لوگ مقامی آبادیوں کو فراخ دلی سے زندہ رہنے کا حق دینے کو تیار تھے بشرطیکہ ان کو سونا چاندی، ٹیکس، غلام اور سستی بلکہ مفت کی محنت نوآبادیاتی حلقوں سے حاصل ہوتی رہے۔

لیکن کئی شکاریوں کا شکارگاہوں میں بیک دم کود پڑنا ان کے درمیان باہمی تصادم و کشمکش کا محرک ہوا۔ ادھر تو تصادم شکارگاہوں کے اندر بر سر موقع پورے تسلسل سے ہو رہا تھا، ادھر یہ مشکل کہ اس کا اصل فیصلہ نوآبادکاروں کی وطنی حکومتوں کے درمیان کئی ہزار میل کی دوری پر ہوتا تھا۔ یہ دور وہ ہے جس میں کسی حکومت کی اصل طاقت بحری طاقت تھی اور تاریخی حقیقت یہ تسلیم کی جاتی تھی کہ "جس کا سمندر ہے اسی کا ساحل بھی ہے"
چنانچہ انگلستان اور ہالینڈ کے درمیان بحری جنگوں کا سلسلہ کئی برس جاری رہا جس کی تفصیل یہاں دینا غیر ضروری ہے۔ البتہ فرانس اور انگلستان کے درمیان جو معرکہ آرائی ہوئی اور جس کا فیصلہ امریکہ ہی کی سرزمین پر انگلستان کے حق میں ہوا وہ ہمارے موضوع سے زیادہ قریبی تعلق رکھتی ہے اس لیے اس کے بارے میں چند سطریں لکھے بغیر چارہ نہیں

امریکہ کی دریافت کے بعد یورپ کے بادشاہوں اور تاجروں کے لیے اولاً جو چیز جاذب توجہ ہوئی وہ سونے چاندی کی کانیں تھیں۔ لیکن آگے چل کر اس سرزمین کی سونا اگل سکنے والی کنواری مٹی، اس کے ان چھوٹے

قدرتی ذرائع و وسائل، نو آباد کاروں کو اپنی کھلی ہوئی گود کی طرف دعوت دینے والے وسیع علاقے بھی اہل عزم و ہمت کو اپنی طرف کھینچنے لگے۔ یورپ کے لیے جیسے ایک جہانِ نو کے دروازے کھل گئے۔ ۱۴۹۷ء کا واقعہ ہے کہ کیبٹ (CABOT) نے برطانوی جھنڈا انہیں لیے امریکہ کے شمالی حصے میں قدم رکھا اور اس جھنڈے نے کہا کہ پورا امریکہ برطانیہ کی ملکیت ہے۔ ۲۷ برس بعد جیووینی دیرازینو فرانسیسی جھنڈا لہراتا آ پہنچا اور اس نے فرانس کے لیے اس دعوے کا موقع پیدا کیا کہ امریکہ ہمارا ہے۔

برطانوی اور فرانسیسی نو آباد کاروں میں ایک بنیادی فرق تھا جس کا اثر خود انقلاب امریکہ کے پیچھے کام کرنے والا تھا۔ برطانیہ سے مجرموں اور باغیوں کے علاوہ زیادہ تر جو لوگ امریکہ آئے وہ ایسے لوگ تھے جو اپنے مذہبی تصورات کے ساتھ اپنے وطن میں سکھ چین نہ پا سکنے اور سیاسی استبداد کا شکار ہونے کی وجہ سے یہاں ہجرت کر کے چلے آ رہے تھے۔ مثلاً پیوریٹن تھے جن کی ایک بڑی تعداد ۱۶۲۰ء میں نیوزی لینڈ کو منتقل ہوئی۔ اور (QUAKERS)[1] تھے جو ۱۶۸۱ء میں پنسلوانیا میں آ ٹکے۔ سیاسی اور مذہبی اور سماجی وجوہ سے جن لوگوں کے لیے انگلستان میں سکون کی زندگی کا امکان نہ رہا، انہوں نے امریکہ کی آزاد فضاؤں کا رُخ کیا۔ ایسے عناصر بادشاہی اقتدار کا بوجھ گردن سے اتار کر ایک نئی آزاد اور خوش و خرم زندگی کی نیو ڈالنا چاہتے تھے۔ یاد رہے کہ ان کے ذہنوں میں انگلستان کی سترھویں صدی کی سیاسی کشمکش کا پورا ماحول رچا بسا ہوا تھا اور انقلابِ انگلستان کے فکری بیج یہ اپنی جھولیاں بھر کے چلے تھے۔

دوسری طرف فرانسیسی نو آبادکاروں کی سیاسی ساخت بالکل دوسری تھی۔ یہ لوگ ایک بادشاہی اقتدار کی وفادار رعایا بلکہ اس کے ملازم ہونے کی حیثیت سے میدان میں اترے تھے اور انہوں نے نو آبادیاتی مہم تاج کے زیر فرمان شروع کی تھی۔ مذہبی انحراف پسندوں مثلاً (HUGUENOTS)[2] اور پروٹسٹنٹوں پر انہوں نے نو آبادیات کے دروازے بند رکھے۔ کیونکہ ان کو اندیشہ یہ تھا کہ یہ عناصر اپنے باغیانہ خیالات پھیلا کر مقامی آبادی کا ذہن خراب کر دیں گے اور یسوعی پادریوں کی تبلیغ کے لیے میدان تنگ ہو جائے گا۔

برطانوی لوگ امریکہ میں منتقلاً بس جانے کے لیے آئے تھے، لیکن فرانسیسی صرف ادائے فرض کے لیے

---

[1] یہ ایک انحراف پسند گروہ سے تعلق رکھنے والوں کا اصطلاحی نام ہے۔ انہوں نے اپنے آپ کو (SOCIETY OF FRIENDS) کے نام سے موسوم کیا تھا۔

[2] سولھویں صدی کی مذہبی جنگوں کے فرانسیسی دور کا پیدا کردہ فرانسیسی پروٹسٹنٹ گروہ۔

آئے تھے اور اولین موقع ملتے ہی وطن واپس لوٹنے کے آرزومند تھے!

برطانوی فرامینِ عطا کی رُو سے نوآبادکار کمپنیوں کو ایک ساحل سے دوسرے ساحل تک کا پورا علاقہ بالعموم حاصل ہوتا تھا لیکن ایک صدی کے اندر فرانسیسیوں نے ۶۰ قلعہ بندیوں کی لائن قائم کرکے سرزمین واقعہ پر برطانوی نوآبادیوں کا سمندر سے رابطہ توڑ دیا۔ اس لیے عملاً برطانوی حدود ان قلعہ بندیوں کی لائن پر آکر ختم ہو جاتی تھیں۔ ایک طرف اس آہنی خط کو قائم رکھنے اور دوسری طرف سے اسے توڑ دینے کے لیے کشمکش کا جو دور گذرا ہے اس نے دونوں طرف سے جان و مال کی بڑی بھاری بھینٹ لی۔

اسٹوارٹ خاندان کے دور میں برطانیہ اور فرانس کی باہمی جنگ کا کوئی امکان نہ تھا لیکن ۱۶۸۹ء میں جب اس خاندان کا نام و نشان تک انگلستان میں نہ رہا اور ڈچ ولیم تخت نشین ہوا تو فریقین کے درمیان شمالی امریکہ کے مقبوضات کے لیے تصادم شروع ہو گیا۔ یہ تصادم معاہدہ پیرس دسمبر ۱۷۶۳ء کے ذریعے ختم ہوا اور اب پورا شمالی امریکہ برطانوی تسلط میں آگیا۔

برطانوی لوگ جو تیرہ نوآبادیوں میں بس رہے تھے فرانس کو شکست دینے کے بعد ذہنی لحاظ سے اپنے آپ کو تاجِ انگلستان کی سرپرستی سے بے نیاز محسوس کرنے لگے۔ علاوہ بریں امریکہ کی آزاد ہواؤں میں سانس لینے اور کھلے آسمان کے نیچے جولانیاں دکھانے کی وجہ سے ان کے دلوں میں آزادی کی ہوا بھرنے لگی۔ یہ گویا اپنے آپ بادشاہ تھے۔ یہ لوگ سرگرم اور جفاکش بھی تھے، ورنہ سمندر پار کرکے اتنی دور آتے ہی کیونکر! ترکِ وطن اور تعمیرِ نو اور جنگ و جدل نے ان کے عزم و ہمت میں روز افزوں اضافہ کر دیا۔ اب یہ لوگ تاج برطانیہ کے زیرِ نگیں رہنے کے لیے موزوں نہیں رہے تھے لیکن برطانوی حکومت ان کو اول روز سے اپنا محکوم سمجھتی تھی۔ اور ان کے آزادی پسندانہ رجحانات اسے کبھی پسند نہیں آسکتے تھے۔ یہ دو متضاد رجحانات تھے جو ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوتے جارہے تھے۔ تاریخ کا ایک مستقل معمول یہ ہے کہ جب کبھی دو متضاد رجحانات آمنے سامنے آجاتے ہیں تو پھر وہ انتہا پسندی کی طرف ارتقا کرتے ہیں، یہاں تک کہ ان میں فیصلہ کن ٹکر ہو جاتی ہے اور پھر ایک رجحان دوسرے کو چت کرکے چھوڑتا ہے۔ تاریخ کا یہی معمول ہر انقلاب میں کام کرتا ہے یہاں بھی اسی تاریخی معمول نے اپنا کرشمہ دکھایا! برطانوی حکومت نوآبادکاروں کے لیے اور نوآبادکار برطانوی حکومت

کے لیے پریشانی کے اسباب پیدا کرنے لگے۔ بدگمانیاں اُبھریں اور ہر بدگمانی مزید بدگمانی پیدا کرتی چلی گئی۔ اس ذہنی اُلجھاؤ کو باقاعدہ سیاسی کشمکش میں بدلنے میں سب سے بڑا پارٹ حکومتِ انگلستان کی تجارتی پالیسی کا ہے۔ حکومت جس کے پیچھے ایک سوداگرانہ نظام کام کر رہا تھا، اس امر کے درپے تھی کہ انگلستان کے تجارتی مفاد کو محفوظ کیا جائے۔ چنانچہ تجارتی قانون سازی اور محصولات کے عائد کرنے میں نوآبادیات کے مفاد کو انگلستان کے مفاد پر بھینٹ چڑھایا جانے لگا۔ مثلاً ۱۷۶۵ء میں قانونِ دستاویزات (...amps Act) پاس کیا گیا جس کا تقاضا یہ تھا کہ نوآبادیات کی تمام رسمی و قانونی دستاویزات لازماً برطانوی اسٹامپ پر لکھی جائیں۔ ڈیوٹی کی رقم برطانوی خزانے میں داخل ہو اور یہ کہ ٹیکس لگانے کا پورا پورا اختیار پارلیمنٹ کو حاصل ہو۔ علاوہ بریں ساتھ ہی یہ بھی قرار پایا کہ امریکی سرزمین پر برطانیہ کی طرف سے ایک مستقل فوج انحراف اور بغاوت کو روکنے کے لیے رکھی جائے جس کے خرچ کا ایک حصہ خود نوآبادیات ادا کریں۔ اس پر برطانوی نوآبادکاروں کے اندر اندر کھولنے والے جذبات کا لاوہ پھٹ کر نکلا۔ ایک ہمہ گیر صدائے احتجاج بلند ہوئی جو نظریاتی رنگ پاکر اس نعرے میں ڈھلی کہ حکومت کا ٹیکس عائد کرنے کا اختیار اور عوام کا نمائندگی کا حق باہم دگر لازم ملزوم ہیں۔ جس حکومت اور پارلیمنٹ میں ہماری نمائندگی نہیں، جس کے لیے ہم ووٹ نہیں دے سکتے اور جس کے اندر ہماری آواز نہیں، اسے ہم پر ٹیکس لگانے کا حق بھی حاصل نہیں۔ برطانوی حکومت نے اس کے جواب میں "قانونِ دستاویزات" سے ایک قدم پیچھے ہٹاتے ہوئے ایک اور قانون ...atory Act کے نام سے پاس کیا جس میں پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے قوانین کو نوآبادیات کے لیے واجب النفاذ قرار دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ انگلستان سے امریکہ میں درآمد ہونے والی بعض اشیاء مثلاً شیشے، رنگوں، کاغذ اور چائے پر نئے درآمدی ٹیکس عائد کیے گئے۔ اس احمقانہ اقدام نے بوسٹن کے ساحلی مقام پر بغاوت پیدا کر دی (۱۷۷۰ء) اور برطانوی حکومت کی طرف سے ہجوم پر گولی چلائی گئی۔ نتیجہ کے طور پر ایک بھاری ذہنی طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ اس طوفان کو فرو کرنے کے لیے برطانیہ نے پہلے تو ٹیکس کی مقدار میں کمی کی، پھر بجز چائے کے اور ساری چیزوں سے ٹیکس ہٹا دیا۔ برطانوی وزارت بات کی تہ کو نہ پہنچ سکی کہ معاملہ اب اصولی و نظریاتی معیار پر آ گیا ہے۔ اس نے سارے طوفان کو ٹیکس کی زیادتی کے خلاف وقتی شکایت کا ظہور سمجھا۔

اِدھر نوآبادیوں میں یہ احساس عام ہوگیا کہ امن پسندانہ دلائل سے کام نہیں چلے گا۔ چنانچہ انہوں نے ہتھیار اٹھانے کا تہیہ کرلیا۔ جذبات کشمکش کا بارود خانہ دوسری مرتبہ اس وقت بھک سے اُڑا جب محصول زدہ چائے کے جہازوں کا بیڑہ امریکہ کے ساحل سے جا کر لگا۔ مشتعل ہجوم نے جہازوں میں گھس کر درآمد شدہ چائے کی ساری مقدار تباہ کر ڈالی۔ برطانوی حکومت اس باغیانہ اقدام پر فوج کشی کیے بغیر کیسے رہ سکتی تھی۔ اب وہ تصادم باقاعدہ شروع ہوگیا جو امریکی جنگِ آزادی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ تصادم سات برس تک جاری رہا اور نوآبادکاروں کی قسمت اس دوران میں ہمیشہ ڈانواں ڈول رہی۔ لیکن یکایک واشنگٹن کی شخصیت اُبھری جو فرانسیسی طاقت کو شکست دینے میں نمایاں پارٹ ادا کر چکا تھا۔ جنگ آزادی کی کمان جب اس شخص کے مضبوط ہاتھوں میں چلی گئی تو قسمت نے یاوری کی ۱۷۷۸ء میں فرانس نے برطانیہ کے خلاف اعلانِ جنگ کردیا۔ ۱۷۷۹ء میں ہسپانیہ کے چارلس سوم نے بھی فرانس کی تقلید کی اور ۱۷۸۰ء میں ہالینڈ بھی برطانیہ کے خلاف کود پڑا۔ یورپ کی ان طاقتوں نے واشنگٹن کے ہاتھ مضبوط کرنے میں بھی خاصہ حصّہ لیا۔ یہاں تک کہ ۱۷ اکتوبر ۱۷۸۱ء کو برطانیہ کی طاقت نے آخری شکست کھائی اور آزاد امریکہ وجود پذیر ہوا۔

نوآبادیوں میں سیاسی اور مذہبی کسی لحاظ سے بھی کوئی ایسی وحدت موجود نہ تھی جو ان کو متحدہ طاقت میں بدل سکتی۔ پس انگلستان کی فوج کشی کے ردِّعمل نے اور جنگی ضرورت نے ان کو اس لاعلاج انتشار سے نکال کر اتحاد و ائتلاف کی طرف مائل کیا جو ان میں شروع سے کارفرما تھا۔ ریاستوں کے نمائندوں کا پہلا اجتماع مشترک مسائل پر غور کرنے کے لیے فلاڈلفیا میں جمع ہوا۔ یہیں سے درحقیقت اس وفاقی کانگریس کی نیو پڑتی ہے جو آج امریکی طاقت کی عناں بردار ہے۔ جون جولائی (۱۷۷۶ء) میں ریاستوں کے نمائندوں کی ایک تاریخی کانفرنس نے وہ یادگاری فیصلے کیے جو صرف اہلِ عزیمت ہی سے متوقع ہوسکتے ہیں۔ اس مجلس نے امریکہ کے بالاترین سیاسی اقتدار کا مقام لے لیا اور فوجی اور جنگی طاقت کی باگ ڈور تھام لی!

(باقی)

رسائل و مسائل

جانداروں پر رحم

سوال۔ میں "انسداد بے رحمی جانوراں" کا دلدادہ ہوں۔ اور ویٹرنری ڈپارٹمنٹ کا پنشن یافتہ افسر ہوں۔ مجھے اسلام کے ایسے احکام و ہدایات کی ضرورت ہے جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جانوروں سے ہمدردی اور ان کے حقوق انسانوں پر واجب ہیں۔ قرآن مجید میں اس کا اشارہ تو موجود ہے، مثلاً جانوروں کے کان چیرنے کو شیطانی فعل قرار دیا گیا ہے۔ لیکن میں کچھ مزید تفصیلات چاہتا ہوں۔ غالباً احادیث میں بھی ایسے احکام موجود ہوں گے۔ اس لیے مجھے ان احادیث سے آگاہ فرمائیں۔ لندن میں ایک کانفرنس اس مقصد کی خاطر ہونے والی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کم از کم میں وہاں ایک مضمون ایسا پیش کروں جس میں اسلام کا نقطۂ نظر بیان کیا گیا ہو۔

جواب: حیوانات سے آپ کو جو دلچسپی اور ہمدردی ہے، یہ اسلام کی تعلیمات کے بالکل مطابق ہے۔ اس سلسلے میں آپ مضمون کے ذریعے سے اسلام کا نقطۂ نظر پیش کرنے کی جو سعی کر رہے ہیں یہ بھی بہت مبارک ہے۔ اس موضوع پر بیسیوں احادیث موجود ہیں۔ تھوڑی مہلت میں زیادہ احادیث کا تلاش کرنا اور نقل کرنا تو آسان نہیں تاہم سردست چند احادیث کا ترجمہ یہاں دیا جا رہا ہے۔ حوالے ساتھ موجود ہیں۔ اگر ضرورت ہو تو اصل کتب حدیث میں آپ عربی عبارت بھی مطالعہ کر سکتے ہیں۔

۱۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم کسی جانور پر سوار ہو کر سرسبز علاقے میں سے گزرو تو جانور کو چر چگ کر اپنا حق وصول کر لینے دو اور جب تم کسی خشک بے آب و گیاہ علاقے میں پہنچو تو وہاں سے جلدی گزر جاؤ۔ (مسلم، کتاب الامارۃ، باب مراعاۃ مصلحۃ الدواب)

۲۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ سفر میں تھے اور انصار میں سے ایک عورت بھی قافلے میں اونٹنی پر سوار تھی۔

اونٹنی ایک جگہ بدکی اور عورت نے اس پر لعنت بھیجنا شروع کر دی۔ آپ نے فرمایا کہ اس پر سے اُتر جاؤ اور اپنا سامان بھی اتار لو تم نے اس پر لعنت کر دی ہے (مسلم، کتاب البر والصلہ، باب نہی عن لعن الدواب)

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک آدمی جا رہا تھا۔ اُسے سخت پیاس لگی۔ وہ ایک کنوئیں میں اترا اور وہاں سے اس نے پانی پیا جب وہ نکلا تو اُس نے دیکھا کہ ایک کُتا ہے جو ہانپ رہا ہے اور پیاس کی شدت میں گیلی مٹی کھا رہا ہے۔ اُس آدمی نے سوچا کہ اس کتے کا وہی حال ہے جو میرا حال تھا۔ چنانچہ وہ اپنا جوتا لے کر کنوئیں میں اُترا اور اس میں پانی لا کر اُس نے کتے کو پلایا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے اس فعل کو قبول فرما لیا اور اسے بخش دیا۔ صحابہ نے عرض کیا "یا رسول اللہ کیا جانوروں کے بارے میں بھی اجر ہے؟" آپ نے فرمایا "ہر مخلوق جس میں زندگی اور قلب و جگر کی رطوبت پائی جاتی ہے اُس کے بارے میں اجر ہے" (بخاری، کتاب الشرب، باب فضل سقی الماء)

۴۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک عورت عالم رویا میں دکھائی گئی جسے بلی اپنے پنجوں سے نوچ رہی تھی۔ آپ نے پوچھا کہ اسے کیا ہوا ہے۔ آپ کو بتایا گیا کہ اس نے بلی کو باندھ رکھا تھا حتیٰ کہ یہ بھوکی مر گئی تھی۔ (بخاری، کتاب الشرب، باب ایضاً)

۵۔ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ایک ایسے اونٹ پر ہوا جس کا پیٹ اور جس کی پیٹھ (مارے بھوک کے) آپس میں جڑ گئے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ ان بے زبان جانوروں کے بارے میں خدا سے ڈرو۔ ان کو اچھی حالت میں ہی پال کر ان پر سوار ہوا کرو اور اچھی حالت میں ہی چھوڑ کر ان پر سے اُتر جایا کرو۔ (ابو داؤد، کتاب الجہاد، باب ما یؤمر من القیام علی الدواب)

۶۔ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم انصار کے ایک باغ میں داخل ہوئے۔ وہاں ایک اونٹ تھا۔ اونٹ نے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو اس نے ایک درد بھری آواز نکالی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اونٹ کے پاس آئے۔ آپ نے اس کی گردن پر تھپکی دی اور پکارا "اس اونٹ کا مالک کون ہے، اس اونٹ کا مالک کون ہے؟" ایک انصاری نوجوان حاضر ہوا اور عرض کیا "یا رسول اللہ، یہ میرا ہے" آپ نے فرمایا "کیا تم لوگ ان چوپایوں کے بارے میں، جن کا تمہیں مالک بنا دیا گیا ہے، خدا سے نہیں ڈرتے۔ یہ تو مجھ سے شکایت کر رہا ہے کہ تم اسے بھوکا رکھتے ہو اور تھکا دیتے ہو۔ (ابو داؤد، ایضاً)

۷۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جانوروں کو لڑانے سے منع فرمایا ہے (ابو داؤد، ایضاً)

۸۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ ایک گدھے کے پاس سے گزرے جس کا چہرہ داغا گیا تھا۔ آپ نے فرمایا

(باقی صفحہ ۲۸۵ پر)

مطبوعات

صحیفۂ ہمام بن منبہ | از جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ شائع کردہ: الھدیٰ بک ایجنسی، نظام شاہی روڈ، حیدرآباد دکن۔ قیمت بلا جلد تین روپے آٹھ آنے۔ مرسلہ: مکتبۂ نشأۃ ثانیہ معظم جاہی مارکیٹ حیدرآباد دکن۔

علمی تحقیق کے میدان میں جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اب تک جو خدمات انجام دی ہیں وہ خالص علمی نقطۂ نظر سے بھی اور اس سے بڑھ کر اسلامی و دینی نقطۂ نظر سے بڑی بھاری قدر و قیمت کی حامل ہیں۔ موصوف کا کیا ہوا کام ملتِ پاکستان کے لیے سرمایۂ افتخار ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ تازہ ترین نتیجۂ کاوش و جستجو اس کام میں ایک گراں بہا اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ کتاب کا تیسرا ایڈیشن ہمارے سامنے ہے۔

مکتبۂ نشأۃ ثانیہ۔ حیدرآباد دکن کی طرف سے یہ کتاب جس روز ہمیں موصول ہوئی وہ پورا دن ایک عجیب مسرت میں گذرا، جیسے کسی کو اپنا کوئی گمشدہ لعل واپس مل گیا ہو۔ یہ دراصل فتنۂ انکارِ حدیث کے علمبرداروں کے اس دعوے کی ایک قطعی اور صریح تردید ہے کہ احادیث دورِ نبوت کے دو ڈھائی صدی بعد سے مدون ہونا شروع ہوئیں اور وہ بھی بطور ایک جعل و سازش کے! خود دورِ نبوت میں سرے سے احادیث کا ریکارڈ نہیں کیا گیا، بلکہ اُلٹا اس کی مخالفت کر دی گئی تھی۔ یہ دعویٰ درحقیقت جس نتیجے تک پہنچانے کے لیے نمودار ہوا وہ یہ تھا کہ سنتِ رسول کو شرعی حجت و سند ہونے کی حیثیت نظامِ دینی میں حاصل نہیں۔ اس کے جواب میں بہت سے اہلِ علم نے بڑا قوی استدلال کیا ہے اور دورِ نبوی کے اندر حدیث کو ریکارڈ کرنے کا جو کام ہوا تھا اس کا تفصیلی تعارف کرایا ہے۔ چنانچہ اسی سلسلے میں آنحضور کے خاص الخاص شاگردوں اور زیرِ تربیت صحابہ کے مرتب کردہ مجموعہ ہائے احادیث کے بارے میں تاریخی شہادتیں پیش کی گئی ہیں۔ مگر یہ چیزیں معقول اور سنجیدہ اصحاب کے لیے تو موجبِ اطمینان ہو سکتی ہیں، اہلِ فتنہ کا منہ بند نہیں کر سکتیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اس سلسلے میں ایک ٹھوس تحقیقی مہم یہ شروع کی ہے کہ دورِ نبوت کی دستاویزات، مکاتیب، سرکاری

مراسلات اور ان کے ساتھ ساتھ صحابہ کے مرتب کردہ صحف کو تاریخ کے خزائن میں سے برآمد کیا جائے چنانچہ اس قسم کے نتائج تحقیق "عہدِ نبوی کے نظامِ حکمرانی" "رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی" "الوثائق السیاسیہ فی العہد النبوی والخلافۃ الراشدہ" (مطبوعہ مصر) وغیرہ میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ "صحیفۂ ہمام ابن منبہ" اسی نوعیت کا ایک نیا حاصلِ جستجو ہے۔ اب اس صحیفہ کی حقیقت سنئے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ یمنی تھے اور دنیا و مافیہا سے کٹ کر نبی اکرم صلعم کے ہو رہے اور اپنی ساری توجہ علم کتاب و سنت کے اکتساب کے لیے وقف کر دی۔ اسی لیے آپ محدثین کے لیے سلسلۂ روایت حدیث کی اہم ترین اولین کڑیوں میں سے ایک ہیں۔ آپ نے حفظِ حدیث کے علاوہ تحریری طور پر بھی احادیث کا ریکارڈ رکھا ہے۔ آپ کے ایک ہم وطن ہمام بن منبہ دین سیکھنے مدینہ آئے تو وطنی نسبت کے زیرِ اثر حضرت ابوہریرہ سے خاص تعلق ہوا۔ آپ نے ان کو ڈیڑھ سو احادیث اہتمام سے املا کرائیں اور اس طرح ایک مجموعۂ احادیث "الصحیفۃ الصحیحہ" مرتب ہوگیا۔ یہ واقعہ بہرحال حضرت ابوہریرہ کی وفات سے قبل کا ہو سکتا ہے اور آپ کا سالِ وصال ۵۸ھ یا اس کے لگ بھگ ہے گویا یہ مجموعہ قطعی طور پر پہلی صدی ہجری کے وسط کا ہوا۔ اس مجموعہ کو محدثین، خصوصاً امام بخاری نے بنیادی مآخذ کی صف میں لیا ہے۔ اور اس کی پوری احادیث صحاح ستہ میں دیکھی جاسکتی ہیں[۱]۔ کمال یہ ہے کہ بعد کے مؤلفوں نے مفہوم تو کیا، کوئی لفظ تک نہیں بدلا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے مزید ضمنی تحقیق و کاوش کرکے یہ بھی بتایا ہے کہ صحیفۂ ہمام کس طرح یہ حفاظت منتقل ہوتا چلا آیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کے مختلف مخطوطات کو ڈھونڈ نکالا ہے اور ان کا پورا پورا تقابل بھی کر دیا ہے۔ بقول ڈاکٹر صاحب اب یہ چیز ثابت ہوگئی ہے کہ:

> "امام بخاری نے کوئی چیز من گھڑت اور جعل سازی کرکے نہیں لکھی بلکہ اسناد میں ماخذ در ماخذ کا جو سلسلہ دیا ہے وہ پورے کا پورا واقعی اور حقیقی بھی ہے اور اب تمام ہمارے سامنے آجانے سے ان کی صداقت کی جانچ بھی ممکن ہوگئی ہے اور یہ سب کے سب سچے ثابت ہوئے اور کس شان کے ساتھ!"

واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے علمبرداران سنت کو منکرینِ حدیث کے مقابلے میں ایک مضبوط ہتھیار فراہم کر دیا ہے۔ ابھی ڈاکٹر صاحب مزید کام کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کے وعدے کے ساتھ "اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ"

---

[۱] واضح رہے کہ یہی احادیث دوسرے صحابہ سے بھی مروی ہیں اور مختلف سلسلہ ہائے اسناد سے ثابت ہیں۔

کا جو مژدہ سنایا تھا اس کی وجہ سے ہم پہلے سے یقین رکھتے ہیں کہ "تبیینِ کتاب" کے کارنامۂ نبوی کی بھی اللہ تعالیٰ خود حفاظت فرمانے والا ہے۔ عہدِ نبوی کے وثائق و مخطوطات کے دوسرے ریکارڈ کے ساتھ ساتھ صحیفۂ ہمام کی برآمدگی نے اس یقین کو اور پہلے سے زیادہ مستحکم کر دیا ہے۔

کتاب میں صحیفۂ صحیح کو جدید اسلوب پر ایڈٹ کر کے متن اور ترجمہ دینے کے علاوہ ایک قیمتی دیباچہ بھی ڈاکٹر صاحب نے قلمبند فرمایا ہے جو بجائے خود اہم معلومات اور قیمتی انکشافات پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک طرف خاصی تفصیل سے یہ دکھایا گیا ہے کہ آنحضور صلعم نے خواندگی اور علم کو عام کرنے کے لیے کتنا کام کن کن تدابیر سے کیا اور کس طرح سوسائٹی کو اس قابل بنایا کہ دین و حکمت اور کتاب و سنت کو محفوظ کر سکے اور جوں کا توں آگے منتقل کر سکے۔ دوسری طرف یہ واضح کیا ہے کہ سنتِ رسالت اور احادیثِ نبوی کا تحریری ریکارڈ خود دورِ رسالت میں کہاں تک ہوا۔ اور اس میں کیا کچھ اب ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ بعد میں مزید تحقیق کرنے پر کچھ اور قیمتی معلومات ہاتھ آئیں، ان کو کتاب کے آخر میں "بازیادہ" کے زیرِ عنوان دیا گیا ہے۔ اس حصے کو پڑھنے سے گویا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پورے سیکرٹری ایٹ سے تعارف حاصل ہو جاتا ہے۔

احادیث کے ترجمہ پر راقم الحروف کوئی ماہرانہ رائے تو نہیں دے سکتا تاہم بعض مواقع قابلِ غور معلوم ہوئے ہیں۔ حدیث ۲۹ و ۱۰۲ میں جنگ کو "خدعہ" فرمایا گیا ہے، اس لفظ کا ترجمہ "دھوکا" کے لفظ سے کیا گیا ہے حالانکہ اردو زبان میں "دھوکا" کا لفظ لازماً بُرے معنی رکھتا ہے اور اخلاقِ حسن سے ٹکراتا ہے پس کیا یہ موزوں نہ ہوگا کہ اردو میں "خدعہ" کا ترجمہ "چال" وغیرہ الفاظ سے کیا جائے۔

حدیث ۳۰ میں عالمِ جنت کے متعلق آیا ہے کہ "ولا خَطَرَ علی قلبِ بشر" اس کا یہ ترجمہ کہ "نہ کسی آدمی کے دل میں اُن کا خطرہ گزرا" اردو زبان کے لحاظ سے بہت بے ڈھنگا ہے۔ بروئے لغت "خطر الامر لہ" کے معنی "اگر لاح فی فکرہ" ہیں اور "خطرہ الامر ببالہ و علیٰ و فی بالہ" کا مطلب "اگر ذکرہ بعد نسیان" کے الفاظ سے معین ہوتا ہے تو مذکورہ ترجمہ کبھی صحیح نہیں ہو سکتا۔ اصل مدعا یہ ہے کہ وہاں وہ کچھ ہے جسے نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا اور نہ انسانی ذہن اس کا خیال یا تصور تک کر سکتا ہے۔

حدیث ۱۱ کے ترجمہ میں گناہ کو مونث قرار دے کر "گناہیں معاف کر دی جاتی ہیں" کا فقرہ درج کیا گیا ہے۔

انقلابیہ حیدرآبادی زبان کے امتیازات میں سے ہوگا، لیکن عام اردو دانوں کے لیے نامانوس ہے۔
حدیث ۵۹ میں "اجب ربك" کا ترجمہ دیا گیا ہے "تمہارے پروردگار کے پاس چلو" حالانکہ اردو میں کہنا چاہیے تھا "اپنے پروردگار کے پاس چلو"!

سب سے بڑی خوشی ہمیں اس بات سے ہوئی کہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب جو شروع شروع میں مستشرقین کی طرح صرف دماغ ہی دماغ کی جولانگاہوں کی طرف رُخ کرکے چلے تھے، بعد میں آہستہ آہستہ ان کا دل بھی متحرک ہوتا گیا اور اب دلیل کے ساتھ جذبہ، عقلیت کے ساتھ ایمان اور تحقیق کے ساتھ ساتھ مقصدیت بھی کارفرما ہے۔

ہم اس کتاب کی اشاعت پر اسلامک پبلیکیشنز سوسائٹی کو مبارک باد پیش کرتے ہیں جس نے نہایت مفید اور ضروری کاموں کا منصوبہ بنا کر صحیفۂ ہمام جیسی نادر چیزیں پیش کرنے کا آغاز کیا ہے۔ الہدیٰ پرنٹنگ پریس بھی ہمارے ہدیۂ تبریک سے حصہ پانے کی مستحق ہے جس کے اہتمام سے یہ کتاب طبع ہوئی۔

بقیہ رسائل و مسائل

" کیا تمہیں معلوم نہیں ہوا کہ میں نے اس شخص پر لعنت کی ہے جو جانور کے چہرے پر داغ دے اور اُس کے چہرے پر ضرب لگائے (ابوداؤد)

۹۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "خبردار جانوروں کی پشت کو اپنے لیے منبر نہ بنا لیا کرو۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں محض اس خاطر تمہارے لیے مسخر کیا ہے کہ تم وہاں تک پہنچ سکو جہاں تک تم بڑی جان جوکھوں سے پہنچتے۔ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے زمین بنائی ہے، اپنی دیگر ضروریات اُس پر بیٹھ کر پوری کرو" (ابوداؤد، ایضاً)

۱۰۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چیونٹی اور شہد کی مکھی کو قتل کرنے سے منع فرمایا ہے۔ (مسند احمد، جلد اول ص ۳۳۲)

۱۱۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ سفر میں ایک جگہ پڑاؤ کیا۔ ایک صحابی جنگل میں گئے اور وہاں سے ایک پرندے کے انڈے نکال لائے۔ پرندہ آیا اور اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے سروں پر آکر اُڑنا اور پھڑپھڑانا شروع کیا۔ آپؐ نے فرمایا "تم میں سے کسی نے اسے دکھ پہنچایا ہے؟" وہ صحابی بولے "میں اس کے انڈے اٹھا لایا ہوں" آپ نے فرمایا "واپس رکھ کر آؤ" (مسند احمد، ج ۱، ص ۴۰۴)

۱۲۔ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر چیونٹیوں کی ایک آبادی پر ہوا جسے جلا دیا گیا تھا۔ آپؐ نے فرمایا کسی انسان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی کو ایسا عذاب دے جو صرف اللہ کے لیے خاص ہے (مسند احمد، ج ۱، ص ۴۲۳)

خـــالی صفحـــه

مجموعہ تفاسیر فراہی

تالیف : مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ : مولانا امین احسن اصلاحی

مولانا حمید الدین فراہی اس دور آخر میں تفسیر کے امام گذرے ہیں۔ انہوں نے قرآن پر فکر و تدبر کی نئی راہیں کھولیں اور اس کی وہ مشکلیں حل کیں جو اب تک تفسیر کی کتابوں میں حل نہیں ہو سکی تھیں۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی اصل تفسیر عربی میں ہے۔ اس کے جو اجزاء شائع ہو چکے تھے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد خاص

مولانا امین احسن اصلاحی

نے ان کا شستہ اور شگفتہ اردو میں ترجمہ کر دیا ہے۔ اور شروع میں مصنف کے مختصر حالات زندگی بھی دے دئے ہیں اور مولانا حمید الدین فراہی کے مقدمہ تفسیر کا ترجمہ بھی شامل کر دیا ہے جو اصول تفسیر پر مولانا کے قلم سے ایک نہایت جامع رسالہ ہے۔ اس مجموعہ میں مقدمہ تفسیر کے علاوہ مندرجہ ذیل سورتوں کی تفسیروں کے ترجمے شامل ہیں:-

تفسیر آیۃ بسم اللہ' تفسیر سورۃ فاتحہ' سورۃ ذاریات' سورۃ قیامہ' سورۃ تحریم' سورۃ عبس' سورۃ و الشمس' سورۃ و التین' سورۃ و العصر' سورۃ فیل' سورۃ کوثر' سورۃ کافرون' سورۃ لہب' سورۃ اخلاص۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں سے ہر تفسیر میں قرآن مجید کی ایسی اہم مشکلیں حل کی ہیں جو قرآن کے دوسرے مشکل مقامات کے حل کے لئے کلید کا کام دیتی ہیں اور یہ بات پورے اطمینان سے کہی جا سکتی ہے کہ اگر ایک شخص مولانا کے مقدمہ تفسیر قرآن کی روشنی میں ان تمام اجزاء کا بغور مطالعہ کرے تو وہ مولانا فراہی کے اسلوب فکر سے اچھی طرح آشنا ہو جائیگا اور قرآن پر عقاقانہ تدبر کے لئے اپنی راہیں خود کھول لیگا۔

تفسیری حقائق و معارف کا یہ مجموعہ ۵۲۷ صفحات ۲۰×۲۶/۸ سائز پر مشتمل ہے اور اس کے متعلق بلا تکلف یہ دعوی کیا جا سکتا ہے کہ اسکا ہر صفحہ تفسیری حقائق کا بیش بہا گنجینہ ہے۔ کتابت و طباعت نہایت نفیس۔ جلد عمدہ کپڑے کی .... قیمت: چودہ روپے

تعلیمات

تعلیم کے موضوع پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اب تک جو کچھ فرمایا یا لکھا ہے نیز جماعت اسلامی نے تعلیم کے موجودہ تصور اور رائج الوقت طریق تعلیم اور نصاب میں جس انقلابی تبدیلی کی اسکیم پیش کی ہے اس سارے مواد کو اس مجموعے میں یکجا کر دیا گیا ہے۔ دیدہ زیب گرد پوش کے ۲۰×۳۰/۱۶ سائز سفید کاغذ ۲۸۸ صفحات قیمت صرف تین روپے۔ فوراً اپنی فرمائش سے مطلع فرمائیں۔

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان - اچھرہ - لاہور

سرورق جدید اردو ٹائپ پریس، لاہور میں چھپا